محمد رضا شاہ پہلوی

ایران کے آخری شہنشاہ کے عروج و زوال کی
کہانی خود ان کی زبانی

اردو پوائنٹ کا نیا قسط وار کتابی سلسلہ

حصہ نمبر 1

فارس سے ایران تک

ماضی کے سبق

ایک نہ ایک دن تاریخ کو اپنا فیصلہ صادر کرنا ہے۔اس کے لئے ہماری تاریخ کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ایران کی بادشاہت کم ازکم تین ہزار سال پرانی ہے۔جس میں اچھے برے ہر طرح کے تغیرات آتے رہے ہیں۔ہر صدی میں کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش رہا ہے،خطرات میں زندگی بسر کرنے کے باعث ایران پختہ ہوگیا ہے۔کوئی قوم ماضی میں زندہ نہیں رہ سکتی،حتیٰ کہ اپنے ماضی میں بھی نہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو قوم اپنے ماضی اور اپنی تاریخ سے رشتہ توڑ لیتی ہے،وہ لازماً تباہ ہو کر رہتی ہے۔ملک فارس جو ہمارے خاندان کے تحت ایران کہلانے لگا،ایک طویل تاریخ رکھتا ہے جو مشکلات ومصائب کے ساتھ ساتھ عظمت وشوکت سے معمور ہے۔

یہ اللہ کا خاص احسان ہے کہ ایران کے مستقبل کے لئے ماضی کے دیے ہوئے سبق بہتر استاد اور رہنما ثابت ہوں گے اور ثابت ہو رہے ہیں۔ہر چیز کو مٹایا جا سکتا ہے،ماضی کو نہیں مٹایا جا سکتا ہے۔اسلئے ہم اپنی اس تصنیف کا آغاز اپنے ماضی ہی سے کر رہے ہیں۔

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نویں صدی قبل مسیح میں آریائی نسل کی ایک شاخ جنوبی روس سے چل کر مغربی ایران کے سلسلہ کوہ زاغروس کے وسطی علاقے میڈیا میں آباد ہوئی اور اسی جغرافیائی نسبت سے یہ لوگ ماؤ کہلائے۔اسی نسل کی ایک دوسری شاخ مشرقی ایران میں وارد ہوئی۔یہ لوگ صوبہ کرمان سے ہوتے ہوئے پارس (فارس) آئے اور پارسی کہلائے۔

مادکو ایک عرصے تک اطمینان نصیب نہ ہو سکا کیونکہ ان کی سرحد اہل آشور سے ملی ہوئی تھی جو ان پر اکثر حملے کرتے رہتے تھے اور انہیں اپنی حافیت کے لئے مسلسل خراج ادا کرنا پڑا تھا۔آخر ساتویں صدی قبل مسیح میں دیوکس نے اپنی قوم کو منظم کر کے آشوریوں کو عبرتناک شکست دی اور میڈیا میں ایک آزاد حکومت قائم کر کے ہمدان کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔۶۱۲ ق م میں ہوا خشتر نے آشوریوں کا مستحکم شہر نینوا فتح کیا اور دریائے دجلہ کے آس پاس کا علاقہ اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔قوم ماد کے آخری بادشاہ آستیاگس پر ۵۵۰ ق میں کوروش اعظم نے فتح پائی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدیم تاریخ کے ساتھ ساتھ ایرانی روایت کے متوازی سلسلے بھی چلتے ہیں جو اہل ایران کیلئے ہمیشہ مایہ افتخار رہے ہیں۔پہلا سلسلہ پیشدادی ہے،جس کے بادشاہوں کے نام یہ ہیں۔

کیومرث ہوشنگ،طہورث،جمشید (جس کی حکومت کا خاتمہ ضحاک کے ہاتھوں ہوا) اور فریدوں (جس نے ضحاک کی اسیری اور ہلاکت کے بعد حکومت سنبھالی) نے مملکت ایران اپنے تینوں بیٹوں سلم،تورا اور ایرج کے مابین تقسیم کر دی۔ایرج کو بڑے بھائیوں نے قریب سے ہلاک کر دیا اور ان کی اولاد کے مابین جنگ کا ایک طویل سلسلہ چلتا رہا۔پیشدادیوں کے بعد کیانی سلسلے کا آغاز ہوا،جس کے مشہور بادشاہ کیقباد،کیکاؤس (جس کی حکومت کی عظمت رستم کی وجہ سے ہوئی) اور کے خسرو ہیں۔لہراسپ،گشتاسپ اور اسفندیار بھی اس دور سے متعلق ہیں۔اس سلسلے کا آخری بادشاہ بہمن ورازدست تھا جس کا ذکر تاریخ میں اردشیر دراز دست کے نام سے آتا ہے۔

دوسرا تاریخی سلسلہ ہخامنشیوں کا ہے جس کی عظمت پر اہل ایران کو اب تک ناز ہے۔اس سلسلے کا اولین بادشاہ کوروش اعظم (۵۵۰ تا ق م) تھا،جس نے آستیاگس پر فتح حاصل کر کے اپنے مورث اعلیٰ ہخامنش کے نام سے ہخامنشی عہد کی تاسیس کی۔اس نے روسیوں کے علاقے فتح کر کے پورے ایشیائے کوچک پر اپنا تسلط قائم کیا۔اس سلسلے کے دوسرے بادشاہ حسب ذیل ہیں۔

کمبوجیہ (۵۲۹ تا ۵۲۱ ق م)

داریوش اول (۵۲۱ تا ۴۸۵ ق م) جس نے بابل اور مصر فتح کرنے کے بعد پنجاب اور سندھ کو مسخر کیا۔ڈینیوب کو عبور کر کے تراکیہ فتح کیا۔پھر مقدونیہ کو بھی زیر کیا اور افریقہ اور چین تک پہنچا۔اس کی وسیع فتوحات پر تاریخ نے اسے داریوش اعظم کا لقب دیا۔

خشیارشا،اردشیر درازدست،داریوش دوم،اردشیر دوم،اردشیر سوم اور داریوش سوم (۳۳۶ تا ۳۳۰ ق م) جسے سکندر اعظم نے شکست دے کر ہخامنشی عہد کا خاتمہ کیا۔ہخامنشیوں کی زبان قدیم فارسی تھی۔اس کا نمونہ کوروش اعظم اور داریوش اعظم اور داریوش اعظم کے کتبوں سے ملتا ہے۔سکندر اعظم کی وفات (۳۲۳ ق م) کے بعد سکندر کی مملکت اس کے جرنیلوں میں تقسیم ہوگئی۔ایران سلیوکس کے حصے میں آیا اور وہاں ۱۸۵ ق م تک سلیوک حکومت قائم رہی۔سلیوکی حکومت کا خاتمہ پارتھیا (خراسان) کے اشکانی خاندان کے مورث اعلیٰ ارشک اول کے ہاتھوں ہوا،جس نے اشکانی عہد کی بنیاد رکھی،آخری اشکانی بادشاہ اردوان پنجم کو 220ء میں اردشیر بابک نے شکست دے کر اپنے

حصہ نمبر 2

نادرشاہ کے بہت سے قصے مشہور ہیں لیکن ہمیں ایک قصہ بہت پسند آیا۔ ہندوستان میں دوران جنگ اس نے سفید داڑھی والے ایک بہادر اور شجاع شخص کو دیکھا اس کی پھرتی اور شجاعت سے متاثر ہو کر اسے اپنے پاس طلب کیا اور پوچھا۔ ''تیرہ سال پہلے تم کہاں تھے؟ فتح اصفہان کے موقع پر تم سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا۔'' بوڑھے نے جواب۔ ''خصور! اس روز میں تو اصفہان ہی میں تھا۔ آپ جانے کہاں تھے۔''

نادرشاہ کو نپولین سے اس لئے تشبیہ دی جاتی ہے کہ اس کی فتوحات بے شمار ہیں۔ اسکے فاتحانہ انداز میں نپولین کی سی سطوت تھی۔ لیکن ایک فرق تھا۔ نپولین نے تو بلا آخر متحدہ محاذ سے شکست کھائی تھی۔ نادرشاہ نے کبھی شکست نہیں کھائی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ نپولین انتہائی اچھا منتظم تھا، جبکہ نادرشاہ میں نظم ونسق کی قابلیت نہ تھی اور اسے ظلم وستم کا چسکا ایسا پڑ گیا تھا کہ اپنے بیٹے کی بھی آنکھیں نکلوا دیں۔

۱۷۴۷ء نادرشاہ کو قتل کر دیا گیا اور اصل طاقت شیراز کے کریم خان زند کے ہاتھ آ گئی۔ اس نے ایران کو ایک متحد حکومت بنا دیا۔ اس کے بیٹے نا اہل ثابت ہوئے اور استر آباد کے قاتار قبیلے کے آغا محمد خان نے پوری سلطنت پر قبضہ جما لیا۔ وہ ۱۷۹۶ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۷۹۷ء میں مارا گیا۔ قاچار خاندان ۱۹۲۵ تک ایران پر حکمران رہا۔

قاچاریوں کے عہد میں ایران کا انتشار، طوائف الملوکی کی حد تک پہنچ گیا۔ ایک ایسی انارکی تھی کہ مغربی طاقتوں کی نئی نئی صنعتوں کی موجودگی میں وہ اور بھی زیادہ افسوسناک اور شرمناک محسوس ہوتی ہے۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے معاشی اقتدار کے نتیجے میں نوآبادیات کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ مغربی طاقتیں معاشی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے کرۂ ارض کے چہار اطراف میں جارحانہ پھیلتی چلی جا رہی تھیں اور ہم اسی حساب سے سکڑتے جا رہے تھے۔ انگلستان اور فرانس کی باہمی کشمکش نے ایران کو الجھا کر رکھ دیا۔ نپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے ایران سے دوستی چاہتا تھا جبکہ یہ انگریزوں کے مفاد کے خلاف تھا۔ ۱۸۱۴ء میں انگلستان نے ایران کے ساتھ عہد نامہ طے کر لیا۔ ادھر روس کے ساتھ ایران کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں صلح نامہ انگلستان اور ۱۶۲۸ء میں صلح نامہ ترکمان چائی کی رو سے ایران کو دریائے ارس کے شمالی میں پورے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ۱۸۵۶ء میں ایران نے ہرات پر قبضہ کر لیا تو برطانیہ نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں صلح نامہ پیرس کی رو سے ایران کو ہرات چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ روسی اثر بڑھ گیا کہ ایران کے بہت سے علاقے روس کے ہاتھ چلے گئے۔ ۱۸۶۷ء میں صوبہ سیستان، افغانستان اور ایران کے مابین تقسیم ہوا۔

قاچار حکمران فتح علی شاہ (۱۷۹۷ تا ۱۸۳۴ء) نے چار جیا پر دوبارہ قبضہ جمانے کی سخت کوشش کی۔ وہ نپولین کا انتہائی مداح تھا۔ ۱۸۰۷ میں نپولین نے جنرل گامٹ دی گروانے کی سربراہی میں سیاسی وفوجی وفد تہران بھیجا تو اس کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ اس مشن نے ایران کے خشکی کے راستوں کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ تاکہ ہندوستان کی جانب ایک طاقتور فوجی مہم روانہ کی جا سکے۔

۱۷۳۹ء میں جب نادرشاہ نے دہلی کو فتح کیا تو اس وقت نپولین مصر میں بیٹھا اس کی فتوحات کا بنظر غائر جائزہ لے رہا تھا۔ آج اس کا ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ محض ایک خواب معلوم ہوتا ہے لیکن فتح علی خان شاہ اور اس کے بیٹے عباس مرزا کی باہمی خط وکتاب جو انہوں نے نپولین جنرل گردانے اور فرانس کے وزیر خارجہ سے کی اور جو تاریکی ریکارڈ میں محفوظ ہیں، اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نپولین ایران کو مغرب کی فصیل قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ ایک ایسا قدرتی اور عجیب ملک ہے کہ جب چاہے مغرب کو مشرق کے خلاف اور مشرق کو مغرب کے خلاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ جنگی اہمیت کے اس علاقے کو جارحیت کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور مداخلت کیلئے بھی۔ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ روسیوں و جنگ سے باز رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ نپولین ہندوستان کی طرف پیش قدمی کر رہا ہو تو روس اوپر سے لشکر کشی کر دے۔ دوسرے یہ بھی ضروری تھا کہ خود اس کا مددگار ملک یعنی ایران فوجی لحاظ سے طاقتور اور خود اعتماد ہو اور اس کے پاس مضبوط توپ خانہ اور کم از کم بیس ہزار جدید کنیں ہوں۔

یہ بھی ضروری تھا کہ ایران کی ایک لاکھ چوالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل مضبوط فوج کو انتہائی سنجیدگی سے جدید خطوط پر تربیت دی جائے۔ تاکہ وہ نپولین کے لشکر کے ہراول دستے کے طور پر بھی کام آ سکیں۔ جنرل گردانے نے ۲۶ جنوری ۱۸۰۸ء کو لکھا۔

''آج تہران کے ہر شخص کے ہونٹوں پر یہ بات ہے کہ نپولین ایران کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والا ہے۔''

تہران، اصفہان اور شیراز کے فرانسیسی سفارت خانوں نے اندازہ لگا کر رپورٹ پیش کی ہندوستان کی مہم کے کامیاب ہونے میں پانچ یا سات ماہ لگ جائیں گے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ نپولین کی ''گرینڈ آرمی''

حصہ نمبر 3

آزادی اور اتحاد

ہمارے والد، رضا شاہ پہلوی

۱۹۰۷ء میں جب روس اور برطانیہ میں معاہدہ طے پایا، ہمارے والد بزرگوار کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اس وقت وہ ایک ایرانی کاسک یونٹ کے کمانڈر تھے۔ وہ بہت عظیم اور قومی الجثہ آدمی تھے۔ جاگیرداروں کے پالے ہوئے غنڈوں، بدمعاشوں اور لیٹروں کے دل ان کا نام سنتے ہی لرز اٹھتے تھے۔ ادیبوں، صحافیوں، مصوروں، مجسمہ سازوں اور فوٹوگرافروں نے اپنے اپنے فن کے میدان میں انہیں مناسب ہدیہ عقیدت پیش کر رکھا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے چھڑنے سے پہلے میکسم گن کی وجہ سے ان کا نام میکسم رضا پڑ گیا تھا۔ ان کا ایک ایسا فوٹو اب تک محفوظ ہے جس میں وہ مشین گن لئے کھڑے ہیں اور خود اس گن پر بھی گولیوں کے لگنے کے نشانات ہیں۔ اس وقت ملک میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مشین گن پر موجود تھیں۔ والد صاحب کی شہرت روز بروز پھیلتی جا رہی تھی۔

۱۹۱۵ء میں جب ایران ترکوں اور جرمنوں اور دوسری طرف روسیوں اور انگریزوں کے مابین میدان بن گیا۔ تو اس بات سے والد کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس پر انہیں غصہ بھی بہت آتا تھا۔

۱۹۱۹ء میں معاہدہ درسیلز کے بعد ایران محض برطانیہ کی ایک نوآبادی بن کر رہ گیا۔ البتہ شمالی صوبوں میں بالشویک انقلابی کے اثرات پہنچ چکے تھے اور کسی بھی وقت وہاں کمیونزم کی فتح کا اعلان ہو سکتا تھا۔

ملک میں یہ حالات تھی جب ہم ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۹ کو پیدا ہوئے۔ والد محترم شمال کی ایک کامیاب اور فتح مند مہم سے واپس آئے اور انہیں بیٹے اور جانشین کی ولادت کی خوشخبری سنائی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ہمارے والد تنہائی میں کبھی کبھی ان مایوس کن حالات و واقعات کی روداد سنایا کرتے تھے۔ ان کے بقول مرکزی حکومت کا کہیں وجود نہ تھا۔ جاگیرداروں، رسہ گیروں اور ان کے حوالی موالی نے ایران کو آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ کوئی قانون نہ تھا۔ امن وامان نہ تھا۔ فوج نہ تھی، پولیس نہ تھی۔ انصاف ملا کرتا تھا جو نا خندہ اور جاہل بھی ہوتا تھا اور لالچی اور مفاد پرست بھی، مسلح ڈاکوؤں اور جاگیرداروں نے اپنی ذاتی عدالتیں قائم کر رکھی تھی۔ جن کا انصاف ملا کے انصاف سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ غیر ملکی خواہ کوئی بھی جرم کریں اور وہ خواہ کتنے بھی بڑے مجرم ہوں، ان پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا کیونکہ یہ بڑی طاقتوں کے باہمی معاہدے کی شرط تھی۔ طہران میں رات کے وقت کوئی ڈاکٹر کی تلاش میں بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے میں تہران میں دو چار ہی ڈاکٹر تھے۔ کسی گلی میں گلی کے موڑ پر صبح ہونے پر لاشیں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔

نقل وحمل کے ذرائع اتنے خراب اور خطرناک تھے کہ کسی کو تہران سے مشہد جانا ہوتا تھا تو وہ پہلے روس جاتا تھا، وہاں سے مشہد آتا تھا۔ خزرستان کے جنوبی صوبے میں داخل ہونے کے لئے ترکی اور میسوپوٹیمیا کے راستے آنا پڑتا تھا۔

UrduPoint.com

ہماری ولادت سے کچھ روز پہلے ہمارے والد ملک کے ان حالات سے اس قدر مایوس و دل شکستہ ہوئے کہ انہوں نے ایسی زندگی پر سپاہیوں کی موت مرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے سفید اصیل گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے دشمن کے اگلے مورچوں تک جایا کرتے۔ دشمن پہلے تو حیران ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ پھر ایک روز نشانہ لے کر بندوق چلائی، لیکن نشانہ خطا گیا۔ کئی بار کوششوں کے باوجود موت نے ان کے قریب آنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ برابر دلیری اور جرات سے دشمن کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے۔ بالشویک انقلاب کے موقع پر انہوں نے روسی افسروں کو مار مار کر ایران سے انکال باہر کیا اور ایرانی کاسکوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کاسک (قزاق) ایک تاتاری قبیلے کا نام ہے جو بحر اسود کے شمال میں آباد ہے اور جس کے افراد اکثر روسی رسالوں میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اب وہ ڈھائی ہزار افراد کے گھڑ سوار رسالے کے کمانڈر تھے اور مقام تھا غزوین، یہ مقام جنگی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا اور انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ یہ ۲۰ اگست کی بات ہے کہ انہیں محسوس ہوا کہ یہ ان کی مادر وطن کیلئے زندگی اور موت کا سوال ہے اور اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

انہوں نے انتہائی خفیہ طریقہ سے تہران کا محاصرہ کر لیا اور ۳۳ فروری ۱۹۲۱ء کو اس زمانے کے حکمران احمد شاہ کو شکست پر مجبور کر دیا۔ یہ محاصرہ اتنا کامیاب تھا کہ چند روز کے اندر اندر بغیر خون خرابے کے حکومت تبدیل ہو گئی۔

ایران میں انگریز افواج کے کمانڈر جنرل آئرن سائڈ نے بعد میں یوں اظہار خیال کیا۔

''رضا خان واحد آدمی تھا جو ایران کو بچا سکتا تھا اور اس نے بچا لیا۔''

ہمارے والد صاحب کے ایک قریبی دوست سید ضیاء الدین تھے۔ سید صاحب نوجوان سیاسی صحافی تھے اور اپنی انگریز دشمنی کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ سید صاحب تین ماہ تک اس نئی حکومت کے سربراہ رہے۔ ہمارے والد وزیر جنگ تھے۔ تین ماہ بعد سید صاحب ایران چھوڑ کر چلے گئے۔ اس اقدام میں ہمارے والد کی بھی رضا

حصہ نمبر 4

مشرق کے بادشاہوں کا سا طنطنہ اور دیگر خصوصیات ان میں مطلق نہ تھیں۔ وہ اپنی ذمے داریوں کو بھی ایک طرح کی فوجی خدمت سمجھتے تھے۔ فرش پر سادہ گدے پر سوتے تھے۔ صبح پانچ بجے سو کر اٹھتے تھے، دن میں صرف دو وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ باقی وقت کام میں مشغول رہتے تھے۔ انہیں کام کا جنون تھا۔ تبدیلی حکومت کے فوراً بعد ایران اور روس نے باہم دوستی اور عدم جارحیت کا معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے سابقہ حکومتوں کے تمام معاہدے اور مراعات وغیرہ ختم ہو گئیں۔ ۱۹۱۹ء کا برطانیہ اور ایران کا معاہدہ جس کی توثیق کبھی پارلیمنٹ نے نہ کی تھی، کالعدم قرار دیا گیا۔ والد صاحب نے ایرانی قوم کے اتحاد پر بہت زور دیا۔ مختلف قبائل کے سرداروں کو اعتماد میں لیا گیا۔ جن لیڈروں کے اینگلو ایرانی آئل کمپنی میں حصص تھے، ان کو بھی یقین دلایا گیا کہ ان کے حقوق پر کوئی ضرب نہ پڑے گی، لیکن رفتہ رفتہ حکومت نے ان کے حصص خرید لیے اور یوں وہ سردار اور لیڈر، گویا تمام قبائل ایک ایک کر کے مرکز کے طابع ہوتے چلے گئے۔

طہران پر قبضے کے بعد والدین محترم نے کہا تھا۔

''کاش میرے پاس فقط ایک ہزار رائفلیں ہوتیں۔'' چنانچہ حکومت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک اچھی مسلح فوج بنائی۔ جلد ہی ایک انفنٹری ڈویژن کھڑی کر لی گئی۔ ایک خودکار بریگیڈ اور موصلات کے نظام کے تحفظ کیلئے چند سپیشل یونٹیں بنائیں۔ قومی شاہراہ پر اہم مقامات پر چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کرائے۔ اس کے بعد انہوں نے پہلے نیوی بنائی اور پھر فضائیہ کی تنظیم کی۔ نئی فوج کے اولین کیڈرز فرانسیسی افسروں پر مشتمل تھی۔ ایرانی افسروں کو تربیت کے لئے فرانس بھیجا جانے لگا۔ وہاں کی مشہور ملٹری اکیڈمی سینٹ سائر جو نپولین نے قائم کی تھی، ایرانی افسروں کو تربیت گاہ بن گئی۔ اس اکیڈمی کے فارغ التحصیل اساتذہ نے بعد میں ہمیں فوجی تربیت دی۔ فوجی قوت کے پہلو بہ پہلو صنعت و حرفت کی ترقی کیلئے ایک نظام اور پروگرام بنایا گیا تاکہ بنیادی اہمیت کی صنعتوں پر خصوصی توجہ دی جائے اور اشیائے صرف ملک ہی میں بنائی جائیں اور درآمدات پر کم سے کم انحصار کیا جائے۔ والد محترمہ کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ زرعی اصلاحات برپا کر کے کسانوں اور کاشت کاروں کے لئے کام کریں لیکن قدرت نے انہیں مہلت نہ دی۔ اس سلسلے میں کچھ روایات کی زنجیریں بھی حائل تھیں، جن کا ذکر ہم آگے حل کر ''سفید انقلاب'' کے باب میں کریں گے جو ہم نے اپنی سرزمین میں زرعی اصلاحات کے سلسلے میں برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔

رفتہ رفتہ والد صاحب نے متمام غیر ملکی اجارہ داریوں کو ختم کر دیا۔ کسٹم ڈیوٹی وغیرہ جو سابقہ حکومت نے بلجیئم کرپٹے پر دے رکھتی تھی اسے اپنے حق میں واگزار کر لیا اور اب اس کی آمدنی کو بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی کیلئے صرف کیا جانے لگا۔ ہماری پولیس سویڈن کے ہاتھوں میں تھی۔ ملک میں جتنے بھی بنک تھے روسیوں کے تھے یا انگریزوں یا ترکوں کے۔ بنک نوٹوں کے اجراء پر بھی انگریزوں کی اجارہ داری تھی۔ تار اور تار برقی کے محکمے بھی انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ ان تمام چیزوں کو موقف کر دیا گیا اور سونے اور ہیرے جواہرات کی بنیاد پر نئے نوٹوں کا اجراء کیا گیا۔ یہ ہیرے جواہرات ہمارے لئے نادر شاہ ہندوستان سے لایا تھا۔

کوہ نور اس وقت بے شک برطانوی تاج کی زینت بنا ہوا ہے لیکن دریائے نور ہمارے پاس بھی ہے جو غالباً کوہ نور سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ قیمتی ہیرا دیگر ہیروں اور جواہرات کے ساتھ تہران کے سنٹرل بنک میں محفوظ ہے۔ اس بنک میں ایسی متعدد تجوریاں ہیں جو موتیوں، ہیروں اور جواہرات سے بھری پڑی ہیں۔ ہمارا خاندان ہمیشہ یہ چیزیں خریدتا رہا ہے۔ دیگر ممالک سے جو تحائف ملتے ہیں وہ بھی ان تجوریوں میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم کو ایرانی قوم کی ملکیت سمجھتے ہیں۔

پندرہ سولہ برس کے جن فسادی لڑکوں نے حال ہی میں مختلف شہروں میں رضا شاہ کے مجسموں کو توڑا ہے، وہ بیچارے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ایران کو تباہی کے گڑھے سے نکال کر اوج کمال پر لے جانے کے لئے والد صاحب نے کتنی تدابیر اور جانفشانی سے کام کیا تھا۔ انہوں نے نئی بستیاں آباد کیں، نئے قصبے تعمیر کرائے، سکول کھولے، ایران کی پہلی یونیورسٹی قائم کی، ہسپتال کھولے، کارخانے کھولے، سڑکیں بنوائیں، بندرگاہیں اور اولین بجلی گھر قائم کیے۔ اس وقت تک کوئی قومی کرنسی نہ تھی۔ نیشنل سٹیٹ بنک سے مرکزی حکومت کی ضمانت پر کاغذی نوٹ جاری کرائے۔ ۱۹۲۷ء میں ٹرانس ایرانی ریلوے کی تعمیر و تنصیب کا کام شروع کیا جو ۱۹۳۹ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ ریلوے لائن پندرہ سو کلومیٹر لمبی تھی جو بحرہ کیسپین سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایران میں فرانس کے طرز اور نمونے پر عدالتی نظام قائم کیا گیا۔ لازمی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا گیا حالانکہ قابل اساتذہ کا قحط تھا۔ جدید قانون اور جدید مسدود و محدود ہو گئے۔

اس بنیادی تبدیلی و ارتقاء کی اہمیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ کیونکہ یہ مشرق قریب کے تقریباً تمام اسلامی ممالک

حصہ نمبر 5

بے شمار سوانح نگاروں نے ہمارے بچپن کے حالات کم وبیش صحیح لکھے ہیں۔ ہم خود بھی یہ حقیقت دوبارہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ابتدائی بچپن میں ہمیں ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا۔ موت سر پر کھڑی تھی اور کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ایک رات خواب میں ہم نے حضرت علیؑ کو دیکھا۔ بس ہمیں یہی محسوس ہوا کہ یہ حضرت علیؑ ہیں۔ امام کے دائیں ہاتھ دودھاری تلوار تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک پیالہ تھا جس میں کوئی مشروب تھا۔ امام نے ہمیں یہ مشروب پینے کا حکم دیا۔ ہم نے تعمیل ارشاد کی، دوسرے دن بخار اتر گیا تھا۔ ہماری صحت بہت جلد بحال ہوگئی تھی۔

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے ہم زیارت کیلئے امام زادہ داؤدؑ جارہے تھے۔ یہ پہاڑ پر ایک زیارت گاہ ہے۔ پہاڑ پر چڑھائی کے وقت ہم اپنے گھوڑے سے گر پڑے اور نیچے چٹانوں پر آپڑے۔ دوسروں کی نظر میں ہم مر گئے تھے لیکن ہمارے جسم پر خراش تک نہ آئی تھی۔ گھوڑے سے گر کر چٹانوں کی طرف آتے ہوئے ہمیں حضرت عباسؑ کی شبیہ نظر آتی تھی اور انہوں نے ہمیں اپنی گود میں اٹھالیا تھا۔ ایک اور بشارت بھی یاد آرہی ہے جو ہمیں شاہی محل میں نظر آئی تھی۔ ہمیں خواب میں حضرت مہدیؑ دکھائی دیے تھے جو ہمارے شیعہ عقیدے کے مطابق روئے عالم میں دوبارہ ظاہر ہوں گے، خواب، بشارت، شبیہ.... یہ چیزیں بے عقیدہ لوگوں کیلئے ایک محض ایک راز ہیں یا فضول خیال، لیکن ہمارے لئے یہ ایک عقیدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے چار ایسے حادثے ہمیں یاد ہیں جب عقیدے نے ہمیں بچایا۔

پہلا حادثہ ہمیں اس وقت پیش آیا جب ہم ایک ہوائی جہاز اصفہان کے قریب خود اڑا رہے تھے۔ وہاں دریا کی گزرگاہ تبدیل ہونے کا کام ہو رہا تھا۔ اصفہان ڈویژن کا جنرل کمانڈنگ آفیسر ہمارے ہمراہ تھا۔ اچانک دوران پرواز ہمارے طیارے کا انجن خراب ہوگیا اور ہچکیاں سی لینے لگا۔ فوری طور پر لینڈ کرنا ضروری تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لینڈ کرنا بہت مشکل تھا۔ نیچے دیہات تھے۔ دائیں ہاتھ پہاڑ تھے۔ بائیں ہاتھ کھیت تھے جن پر فصل کھڑی ہوئی تھی۔ جہاز جھونک کھا رہا تھا۔ ہم نے دائیں طرف کا رخ موڑ کر رفتار بڑھادی تاکہ گرے تو دور جا کر گرے، اچانک یہ منظر دکھائی دیا کہ ایک چوڑا نالہ پہاڑ کے درمیان سے بہہ رہا تھا۔ ہم نے مشکل سے جہاز کو نالے کے اوپر کرلیا کہ اس کی سیدھ میں چلتے جائیں گے جہاز نالے میں گرے تو نقصان کا خطرہ کم تھا۔ انجن میں اب بالکل سکت نہ رہی تھی اور جہاز کسی بھی لمحے گر سکتا تھا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ جہاز کو نالے پر اتار لیا جائے۔ دائیں پہاڑ بائیں پہاڑ بیچ میں نالہ، ہر طرح مصیبت تھی۔ ہم نے خطرہ مول لیا۔ لیکن جہاز کے نیچے اترتے وقت سامنے ایک بڑی چٹان آگئی۔ اب بچنا محال تھا۔ جہاز کے اترتے اترتے نچلا حصہ الگ ہوکر گر پڑا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جہاز کسی قدر ہلکا ہوگیا اور رفتار کو اپنی مرضی کے مطابق کرنے میں آسانی ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے جہاز نے پٹخنی کھائی۔ ہم اور جنرل صاحب گویا الٹے لٹک گئے۔ ہم نے بڑی مشکل سے خود کو جہاز کی حفاظتی پیٹیوں سے آزاد کرایا اور جہاز کے گرنے سے پہلے نالے میں چھلانگ لگادی اور یوں موت سے بال بال بچے۔

ایک اور موقع پر بالکل ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ اب کے ہمارے جہاز ایک تنگ گھاٹی میں گھر گیا۔ میں کنٹرول لور ڈپر بیٹھا ہوا تھا۔ پائلٹ ایک جوان آدمی تھا، ہمیں فوراً محسوس ہوگیا تھا کہ اس گھاٹی سے بچ نکلنا ممکن نہیں۔ ڈائیل کے ہند سے بتا رہے تھے کہ رفتار بھی خراب ہوگئی ہے اور جہاز ہچکولے کھانے لگا ہے۔ جہاز کے پر عمودی شکل میں چلے گئے تھے۔ زمین چند میٹر کے فاصلے پر رہ گئی۔ موت ہمارے انتظار میں تھی جہاز ابھی گر کر پاش پاش ہوجائے گا۔ ہم نے کشش ثقل اور ہوائی حرکات کے تمام اصول وقواعد توڑتے ہوئے محض تحفظ ذات کی خاطر لاشعوری طور پر کچھ ایسے اقدامات کیے کہ جہاز زمین پر آگیا تو ہم دونوں الگ محفوظ پڑے تھے اور جہاز کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اللہ کی شان ہے، قسمت نے ہمارے خالف چکر چلایا تھا لیکن ابھی ہمارا وقت نہ آیا تھا۔ اللہ نے ہمیں بچالیا۔

۴ فروری ۱۹۴۹ء کو ہم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ تہران یونیورسٹی کے یوم تاسیس کی سالانہ تقریب میں مدعو تھے۔ ہم پوری وردی میں ملبوس تھے اور سندات عطا کرنے کی اس تقریب میں خطبہ صدارت دینا تھا۔ تین بجے ہم نے اپنی نشست سنبھالی۔ فوٹو گرافوں نے جلدی جلدی تصویریں اتارنا شروع کیں۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور ہم سے کوئی تین میٹر کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا اور ہماری جانب ایک گن تان لی۔ اوپر تلے تین گولیاں ہمارے ہیٹ میں سوراخ کرتی ہوئی گزر گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہمارے سر کو چھو کر گزری ہیں۔ چوتھی گولی ہمارے دائیں رخسار میں داخل ہوئی اور ناک کے راستے باہر نکل گئی۔ ہماری نظریں مسلسل ہمارے قاتل پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پانچویں مرتبہ گولی مارنے والا تھا۔ ہم فوراً سر جھکا کر گھوم گئے۔ چنانچہ وہ گولی جو سیدھی ہمارے دل کی طرف آرہی تھی، وہ ہمارے کندھے کو آکر لگی، چھٹی گولی باقی تھی، لیکن گن نے کام کرنے سے انکار کردیا۔ حملہ آور کو جس کا نام فخر آرائے تھا۔ اسی وقت قتل کردیا گیا۔ ظاہر ہے اسے مفاد پرستوں نے قتل کرایا ہوگا، تاکہ راز فاش نہ ہوسکے۔ تاہم ہمیں معلوم ہوگیا کہ وہ ایک جنونی مذہب پرست جماعت سے تعلق رکھتا تھا جس کے خیالات ونظریات انتہائی

وہی ہوا'' جس کا انہیں خدشہ تھا۔ اگلے سال ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا والد صاحب اور ہٹلر کے تعلقات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ہٹلر پر ذرا بھی اعتماد نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہٹلر کے سیاسی و فوجی نظریات انتہائی احمقانہ اور انتہائی خطرناک اور مہذب دنیا، بالخصوص ایران کے لئے انتہائی تباہ کن ہیں۔ ایران میں اگر چہ جرمن لوگ کثیر تعداد میں ملازمت کر رہے تھے جن میں سے اکثر و بیشتر بڑے ماہر کاریگر تھے، لیکن والد صاحب نے جنگ کا آغاز ہوتے ہی فوراً اپنی غیر جانب داری کا اعلان کر دیا۔

جنگ کے ابتدائی زمانے میں اور پھر اپریل ۱۹۴۱ء تک، جب تک کہ محوری طاقتوں نے بلقان پر جارحانہ حملہ نہیں کیا، ہمارا خیال تھا کہ اس خوفناک جنگ میں ایران کو ملوث نہیں کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جب روس پر حملہ ہوا، تب بھی ایران نے بڑے دعوے کے ساتھ اپنی غیر جانب داری کا ایک بار پھر اعلان کیا۔ روس کی حالت پتلی ہو گئی۔ اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اتحادیوں سے مدد طلب کی جائے۔ رسد اور کمک مرمانسک کے راستے شمال سے آنا دشوار تھا۔ بحیرہ روم کی طرف سے آنا ممکن نہ تھا۔ ترکی نے آبنائے بند کر دی تھی۔ جنرل رومیل نے شمالی افریقہ پر چڑھائی کر رکھی تھی اور اسکندریہ کسی وقت بھی اس کے تسلط میں آنے والا تھا۔ بلغاریہ اور یونان جرمنی کی ماتحتی میں پہلے ہی جا چکے تھے۔ ۱۹۴۲ء کی سرگرمیوں میں جرمنی کی یونٹیں کوہ قاف میں مائیکوپ کے تیل کے مرکز تک پہنچ چکی تھیں۔

اتحادی طاقتوں کے لئے روس کی مدد کرنے کا صرف ایک وہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا خلیج فارس کا راستہ۔ پس ایران ایک بار پھر سیاسی اعتبار سے نہ سہی جنگی اعتبار سے نہایت اہم علاقہ بن گیا۔ مصر کے شاہ فاروق نے جن کے ہمشیرہ سے ہمارا عقد ہوا تھا، تہران میں اپنے سفیر کی وساطت سے ہمیں آگاہ کیا کہ برطانوی فوج کی حرکت دیکھنے میں آ رہی ہیں اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت ایران پر حملہ آور ہونے والی ہے۔ ہم نے والد صاحب کو آگاہ کیا۔ انہوں نے فوری طور پر لندن میں اپنے سفیر کو تار بھیجا کہ وہ جلد معلوم کر کے بتایا جائے کہ برطانیہ کے اصل عزائم کیا ہیں؟ عین اس زمانے میں اٹلی کے طیاروں نے خلیج فارس کے علاقے میں دو تین بم گرا دیئے؟ کہا یہ گیا کہ خلیج میں جرمنی کے جو تجارتی جہاز موجود ہیں وہ مسلح ہیں اور فوج کے ہیں۔ روس کو رسد اور کمک بھیجنے کے لئے ایران کا راستہ کھولنے پر اتحادی طاقتوں سے معاہدہ ہو سکتا تھا، لیکن لندن میں ہماری سفیر کو تسلی بخش جواب نہ دیا گیا۔ ادھر تہران میں روس اور برطانیہ کے سفیر ہم پر سخت دباؤ ڈال رہے تھے کہ ایران میں جرمنی کے جتنے بھی کاریگر اور ماہرین کام کر رہے ہیں۔ انہیں نکال باہر کیا جائے۔ ہم ابھی اس مشکل صورت حال سے نکلنے کی تدبیریں سوچ ہی رہے تھے اور کوئی مناسب اقدام کرنے والے تھے کہ ۲۳ اگست ۱۹۴۱ء کی صبح کو کسی قسم کی وارننگ یا چیلنج کے بغیر دونوں طاقتوں کی افواج نے ایران پر حملہ کر دیا۔

شمال کے طرف سے روس کی موٹر برد ار فوج نے آزربائیجان کی سرحد عبور کی۔ دوسری روسی یونٹیں خراسان کے مشرق میں اور پوری مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ پوری طاقت سے آگے بڑھیں۔ پانچ برطانوی ڈویژن جنوب مشرق، مغرب اور جنوب سے بڑھی چلی آ رہی تھیں رائل ایئر فورس اہواز۔ بندر شاہ پور اور خرم شہر کے فوجی ٹھکانوں ٹھیک ٹھیک بمباری کر رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے تیل کے کارخانوں کو دانستہ معاف کر رکھا تھا۔ کیونکہ وقت پر ان کے کام آئیں گے۔ ۲۵ اگست کو رائل نیوی کے ایک جنگی جہاز نے آبادان کے قریب ہمارے ایک جہاز کو ڈبو دیا۔ سوویت روس کی فضائیہ نے تبریز، غزوین، بندر پہلوی، فزلیہ اور رشت کے قصبوں پر بم گرائے۔ ماسکو میں ہمارے سفیر مسٹر سعید نے مسٹر مالوٹوف سے احتجاج کیا اور ظاہر ہے کہ دریافت کیا کہ آخر کیا وجہ ہوئی اس بات کی کہ آپ برطانیہ کی ترغیب پر ایران کے خلاف جنگی جارحیت میں اس کے شریک ہونے پر رضامند ہو گئے۔ مالوٹوف نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن ہمیں اب پتا چل گیا ہے کہ ایران کے راستے روس کی مدد کرنے کا فیصلہ پہلے ہی اس وقت ہو گیا تھا جب معاہدے اوقیانوس پر دستخط کرنے کے لئے چرچل اور روزویلٹ ایک امریکی جنگی جہاز پر اکٹھے ہوئے تھے۔

۲۸ اگست کو ہمارے والد رضا شاہ نے اپنی فوج کو ہتھیار رکھ دینے کا حکم دیا۔ ان کو خبردار کیا گیا تھا کہ ہتھیار نہ ڈالے گئے تو ۷ ستمبر کو اتحادی افواج تہران کے محصور شہر میں داخل ہو جائینگے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ برطانوی فوج تہران میں داخل ہو رہی ہے تو انہوں نے ہمیں اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ذرا کیا تمہارے خیال میں ہم ایک معمولی انگریز کپتان سے حکم لیں گے ایسا نہ ہوگا۔

۱۶ ستمبر کو وہ تاج و تخت سے دستبردار ہو گئے۔ پارلیمنٹ کے سامنے یہ اعلان وزیر اعظم فروغی نے پڑھ کر سنایا۔

''میں نے اللہ اور قوم کی تائید کے ساتھ اپنے پیارے بیٹے محمد رضا پہلوی کے حق میں دستبردار ہونے کا نازک فیصلہ کیا ہے۔''

حصہ نمبر 7

ہمارے پہلے وزیر اعظم ابراہیم حکیمی تھے۔ وہ ضعیف العمر تھے مگر بارسوخ، دیانت دار اور انتھک کام کرنے والے۔ انگریز پرست لیکن انتہائی محبِ وطن۔ جب روس سے ہمارے تعلقات میں پیچیدگی پڑ گئی اور معاملے کو حل کرنا ممکن نہ رہا تو ابراہیم حکیمی استعفیٰ دے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ان کے جانشین مسٹر نحوام سے بھی ہماری پوری ذہنی ہم آہنگی نہ ہو سکی۔ وہ اپنی نامزدگی کے فوراً بعد ماسکو گئے اور وہاں جرکا تیل دریافت کرنے اور تیل نکالنے کا ایک معاہدہ کر لیا۔ معاہدے پر ہم سے مشورہ بھی نہ کیا، وہیں کے وہیں دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی رو سے ۵۱ فیصد منافع روس کا اور ۴۹ فیصد منافع ایران کا تھا۔ خوش قسمتی سے معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ جب تک پارلیمنٹ کی توثیق نہ ہو جائے۔ یہ معاہدہ نافذ العمل نہ ہوگا۔ واپسی پر غوام صاحب نے آذربائیجان کے باغیوں سے مذاکرات کئے۔ ہم سے فرمائش کی کہ باغی افسروں کو دو گریڈ کی ترقی دی جائے۔ اس طرح ایک لیفٹیننٹ ایک بٹالین کا انچارج بن جائے گا اور دوسرے افسر بھی خوش ہوں گے۔ ہم نے کہا۔ ایسے حکم نامے پر دستخط کرنے سے پہلے ہم اپنا ہاتھ کاٹ لینا پسند کریں گے۔ فوج کے اکثر و بیشتر لیڈروں نے چیف آف سٹاف علی رزم آرا کے سوا ہمیں مشورہ دیا کہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیے جس سے روسی کم مداخلت کا خطرہ عمل کی صورت اختیار کر لے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہیں گے اور آذربائیجان کی بازیابی کی کوشش کریں گے۔ اکثر سیاست دانوں اور فوجی لیڈروں نے اس فیصلے کو احمقانہ قرار دیا ہے لیکن ہم نے اس کی بنیاد ٹھوس معلومات پر رکھی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ باغی ہم سے زیادہ مسلح نہیں ہیں۔ انہیں روس کے اندرونی علاقوں سے اسلحہ سپلائی اور کمک پہنچنے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ روس اپنی فضائیہ کو حرکت میں لانے کی پوزیشن میں نہ تھا، کیونکہ اس طرح اس کے اپنے ہی آدمیوں پر بمباری ہوتی تھی۔

علاوہ ازیں ہم نے ایک غلام برفرمانروا کی زندگی کی بجائے ایک آبرومندانہ موت کو ترجیح دی۔ غلام کی زندگی پر آزادی کی جنگ بہرحال فوقیت رکھتی ہے تاہم تہران میں امریکہ سفیر جارج ایلن اور ایک اور دوست نے ہمیں خبردار کر دیا۔ امریکہ سو فی صد آپ سے متفق ہے

لیکن آپ کی خاطر ہم روس سے جنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ وزیر اعظم غوام نے ہماری پالیسی سے شدید اختلاف کیا اور ہمیں آذربائیجان کو روس سے واپس لینے کے ارادے سے باز رکھا۔ لیکن ہم فیصلہ کر چکے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ کیا کرنا چاہتے ہیں، ہم نے حملہ کر دیا۔ ہم جنرل رزم آرا کے ہمراہ بذریعہ جہاز اکثر محاذ پر جایا کرتے تھے آخر کار باغیوں کا سرغنہ اور روس کا پٹھو پوشواری فرار ہو گیا اور ان کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ روس کا سفیر ہمارے پاس آیا۔ سخت طیش میں تھا بولا: آپ مملکت کے سربراہ بھی ہیں اور مسلح افواج کے چیف بھی۔ مہربانی کر کے فوری طور پر اپنی فوج کو واپس بلا لیں۔ ورنہ عالمی امن سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہم نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے ہی علاقے کو واگزار کرانے اور وہاں عوامی الیکشن کرانے سے عالمی امن کو یا کسی اور کو کسی نوعیب کا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اب باغیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اور یوں ایران کو دنیا کے نقشے سے مٹانے کی دوسری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ یاد رہے کہ پہلی کوشش ۱۹۰۷ میں ہوئی تھی، جب روس اور برطانیہ نے باہم معاہدہ کر کے ہمارے ملک کو آپس میں دو حصوں بانٹ لیا تھا۔ شمالی روس کے حصے میں آیا تھا اور جنوب برطانیہ کے حصے میں، تب رضا شاہ ہمارے والد نے پہلی جنگ عظیم کے بعد ایران کے ان دونوں حصول کو متحد کیا تھا۔

اس منصوبے کی تجدید دوسری جنگ عظیم کے موقع پر ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر بیون اور امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر بائرنس نے ماسکو میں سٹالن سے مل کر یہ تجویز پیش کی کہ آذربائیجان، کردستان اور خزرستان کے صوبے آزاد اور خود مختار ہونے چاہئیں۔ سٹالن نے یہ تجویز منظور کر لی، لیکن بعد میں مالوٹوف نے سٹالن سے کہا کہ اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے کچھ مدت کے بعد پورا ایران ہی ہمارے تسلط آ جائے گا۔ ایرانی کمیونسٹوں کے تعاون سے روس ایک دو صوبوں ہی پر نہیں، پورے ایران پر قابض ہو جائے گا۔ تب اتحادیوں کا بھی کوئی خوف یا خطرہ نہ ہوگا۔ چنانچہ سٹالن نے بعد میں امریکہ اور برطانیہ کی تجویز مسترد کر دی۔

بہرحال جب ملک میں بیرونی سازشوں کے ذریعے انتشار پیدا نہ کیا جا سکا تو پھر ملکی سیاست کو استعمال کیا جانے لگا بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا۔ پٹھو اور ایجنٹ خریدے گئے۔ ہر قیمت پر طوائف الملوکی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مختلف طریقوں اور ہتھکنڈوں سے ایران کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا گیا جو مقصد وہ ۱۹۰۷ میں اور پھر ۱۹۴۵ حاصل نہ کر سکے وہ انہوں نے ۷۹۔۱۹۷۸ء میں حاصل کر لیا۔

ڈاکٹر مصدق یا بازاری لیڈر

۱۹۴۷ء میں ہم نے آذربائیجان کا دورہ کیا۔ آزاد کردہ صوبے میں ہم جس جگہ بھی گئے، ہمارا والہانہ استقبال ہوا۔

ڈاکٹر مصدق کا جواب سن کر ہم ششدر رہ گئے انہوں نے کہا بشرطیکہ تین شرطیں پوری ہوں۔

۱۔ برطانیہ کو بھی اس سے اتفاق ہو۔

۲۔ روز ہر صبح ہمارے ملاقات ہو اور باہم گفت وشنید ہو۔۔

۳۔ ان کے تحفظ کے لئے ذاتی باڈی گارڈ مقرر کیا جائے۔

ہم نے ان سے کہا کہ ہم نے کبھی برطانیہ سے مشورہ طلب نہیں کیا۔ اگر آپ اصرار کریں گے تو گویا ہمیں روس سے بھی مشورہ کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر مصدق نے جواب دیا۔ آج سے پہلے ایران میں کوئی قدم برطانیہ کی منظوری کے بغیر نہیں اٹھایا گیا۔ رہ گیا روس تو اس کی پرواکرنے کی ضرورت نہیں۔

بہر صورت ہم نے وزیر انصاف جناب اعلا کو برطانیہ اور جزب یزواں پناہ کر روس بھیجا۔ روس نے فوری طور پر ہماری تجویز پر صادر کر دیا۔ برطانوی سفیر نے انکار کر دیا، بلکہ ہمارے وزیر سے صاف ہی کہہ دیا شاہ تو اپنے تاج سے کھیل رہا ہے۔ دونوں مملکتوں سے مذاکرات کے نتائج ڈاکٹر مصدق کے علم میں آئے تو انہوں نے حکومت بنانے کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لیا اور یوں گویا جعلی انتخابات کا طریقہ چلتا رہا۔ انگریز لوگ جو بات بات میں جمہوریت کے علمبردار بنتے ہیں، ایران میں جمہوریت کا وقت آیا انہوں نے جعلی ووٹ بھگتانے کے طرز انتخابات کی حمایت کی۔ جس کی بنیاد خود انہوں نے ڈالی تھی۔

۱۹۵۰ میں نیا آئین نافذ ہو گیا تو اب ہم اپنے سات سالہ منصوبہ، پر پوری توجہ مبذول کر سکتے تھے۔ جس کا آغاز بہت بڑے طریقے سے ہوا تھا۔ منصوبے کا مسودہ جو مطالعے وتبصرے واصلاح کے لئے اریکن اوورسیز ماہرین، کو دیا گیا تھا صرف اسی پر تین لاکھ ڈالر کا خرچہ ہو گیا۔ منصوبہ شروع کرنے کے لئے کم از کم ڈھائی کروڑ ڈالر کی ضرور تھی۔ امریکہ نے امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس منصوبے کا خلاصہ بیان کر دیا جائے تو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ ایرانی معیشت کو مضبوط کیا جائے۔ کسانوں کو زیادہ سے زیادہ امداد دے کر زراعت کو فروغ دیا جائے۔ تیل کی پیداوار بڑھائی جائے اور تیل صاف کرنے کا بندوبست ایران ہی میں کیا جائے۔ ۲۵۶ ملین ڈالر (پینسٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر) کے بجٹ کی تقسیم یوں کی گئی تھی۔

عام معاشرتی بہبود	۲۸٫۶ فی صد
زراعت	۲۵٫۰ فی صد
نقل وحمل	۲۳٫۷ فی صد
صنعت وکان کن	۱۴٫۳ فی صد
تیل کارخانے	۴٫۸ فی صد
مواصلات	۳٫۶ فی صد

اس بجٹ کا بیشتر حصہ تعلیم اور صحت کیلئے مخصوص تھا۔ ہر صوبے میں ۵۰۰ تا ۷۰۰ بستر کا ایک بڑا ہسپتال قائم کرنا اور حفظان صحت کی جدید سہولتیں فراہم کرنا مقصود تھا۔ پانچ ہزار پرائمری سکول، ۱۵۰ تربیت گاہیں، ۳۶ پیشہ ورانہ سکول، کالجوں اور فنی مراکز قائم کرنے کی تدبیر تھی۔ مختلف صوبوں میں تین نئی یونیورسٹیاں قائم کرنا تھیں۔ ہر سال دس لاکھ بچوں اور پونے دو لاکھ بالغوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جانے والا تھا۔ زراعت کے شعبے میں جدید مشینیں رائج کرنے کا خیال تھا۔ دس بند اور بجلی سٹیشن بنانے تھے۔ نئی نہریں بنانی تھیں۔ صنعتی شعبے میں دھات کاری، پارچہ بافی، سیمنٹ، کیمیاوی اشیاء اور کاغذ پر خصوصی توجہ دینے کا وعدہ تھا۔ تین ہزار کلومیٹر سے زیادہ نئی سڑکیں بنانی تھیں۔ موجودہ سڑکوں میں سے ۶۷۰۰ کلومیٹر کی مرمت کی جائے گی۔ تہران سے تبریز تک اور مشہد سے یزد تک نئی ریلوے لائن بچھائی جائے گی۔ نقل وحمل اور آمدورفعت کے ذرائع کو ترقی دی جائے گی۔ خلیج فارس اور بحیرہ کیسپین پر ہماری جتنی بھی بندرگاہیں ہیں ان کو جدید خطوط پر تعمیر کیا جائے گی۔ نئے ہوائی اڈے بنائے جائیں گے۔ پورانوں کی اصلاح ومرمت کی جائے گی ڈاک، تار، ٹیلیفون کے نظام کو وسیع اور پختہ کیا جائے گا۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ فوج کو مضبوط بنایا جائے گا۔ پولیس کو تنظیم کی ضرورت ہے۔ وہ کی جائے گی۔ قبائل سے اسلحہ چھینا جائے گا، بالخصوص جنوب میں، جہاں ہر شخص کے پاس رائفل ہے، سول اور فوجداری قوانین کی نظر ثانی کی جائے گی۔ نئی عدالتیں قائم کی جائیں گی۔ نظم ونسق کی حالت بہتر بنائی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز وہ اپنی حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے ہماری موجودگی میں فرمایا کہ رضا شاہ نے ٹرانس ایرانی ریلوے بنا کر سخت غلطی کی تھی، کیونکہ اس طرح خلیج فارس بحیرہ کیسپین سے مل گئی اور اسی بنا پر انگریزوں کے لئے روس پر حملہ کرنا ممکن ہو گیا۔ ایک طرف تو ان کا یہ حال یہ تھا اور دوسری طرف کی کیفیت یہ تھی کہ جب ہم نے زمانہ جنگ میں ان کو وزیر اعظم بنانا چاہا تو ان کی ایک ہی شرط تھی کہ پہلے برطانیہ بہادر کی منظوری حاصل کی جائے۔ ڈاکٹر مصدق شعلہ بیان مقرر تھے۔ یہ ہمیں تسلیم ہے لیکن سیاست داں کی حیثیت سے ان کے مرتبہ کو جانچنا بہت مشکل ہے کیونکہ وہ قول فعل کے تضادات میں مبتلا تھے۔ ان کی طبیعت یوں تھی کہ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔ ابھی تو وہ بلند بانگ دعوؤں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوتے بہت معراج اور بلندی پر پہنچے ہوئے ہیں اور دوسری ہی لمحے مایوسی اور اداسی کا ایسا شدید دورہ پڑے گا کہ دیکھنے والا دنگ ہو جائے گا کہ اس آدمی کو اچانک یہ کیا ہوا، ابھی تو یقین کامل ایمان پختہ کا پتلا تھا جو اس کی تقریر کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا، یا ابھی یہ حال ہے کہ آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رہا ہے۔ عین اہم موقعوں پر جب کہ سفارتی یا انتظامی سطح پر ان کی ضرورت پڑی تھی وہ "بیمار" ہو کر صاحب فراش ہو جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی عجیب مضحکہ خیز انداز میں ڈراما چا جایا کرتے تھے "ہائے میں مر رہا ہوں"۔ "ہائے میں مر رہا ہوں" یقین اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر مصدق سخت بے عقل اور نا معقول آدمی تھا لیکن چونکہ سیاست سے بے عقل کو بھی عقلمند بنانا یا سمجھنا پڑتا ہے اس لئے سوچ سوچ کر ہم نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس منچلے محب وطن قوم پرست کی کھال کے نیچے ایک ایسا شخص چھپا ہوا ہے جو برطانیہ کا ایجنٹ ہے (بعد میں مجلس ملی کے صدر کی شائع کردہ دستاویزات اور ایران میں برطانوی سفیر سے شیراز میں مقیم برطانوی قونصل کی خفیہ خطوط کتابت سے یہ ثابت بھی ہو گیا)۔ آج یہ انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے نعرے لگا رہا ہے، سات برس پہلے یہ کہتا تھا کہ وزیر اعظم بھی بنوں گا تو برطانیہ کی اجازت اور منظوری سے بنوں گا

۲۸ اپریل ۱۹۵۱ء کو جب ہم نے وزارت عظمیٰ ڈاکٹر مصدق کے حوالے کی تو اس وقت ان کی عمر تہتر سال تھی۔ وہ بہت بڑے جاگیردار تھے اور جاگیرداری ہی کی اساس پر بالآخر برسر اقتدار آ گئے تھے۔ وہ اقتدار بھی چاہتے تھے تو مطلق چاہتے تھے ہم نے ان سے گزارش کی کہ کس قدر اعتدال اور رواداری کی ضرورت ہے۔ ہم نے بتایا کہ ہماری سیاسی اور معاشی آزادی کا آراستہ کانٹوں بھرا ہے، قدم قدم پر مشکلات حائل ہیں، اس لئے ہم بہت تیز دوڑ سکتے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ انہوں نے ہم سے محتاط اور معتدل رہنے کا وعدہ کیا۔ اب ہوا کیا۔ یہ بھی سنیئے:

دو روز کے بعد ۳۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو ان کی درخواست پر مجلس ملی نے تیل کو قومیانے کے حق میں ووٹ دے دیا۔ ہمیں بھی اس فیصلے سے کامل اتفاق تھا اور ہم نے فوری طور پر فرمان پر دستخط کر دیئے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں سے کوئی نیا معاہدہ ہونا چاہیے۔ اور یہی ڈاکٹر صاحب نہیں کریں گے اور انہیں ہونے دیں گے۔ مسلسل دو سال تک ڈاکٹر صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ دنیا ایران کے تیل کے بغیر جی نہیں سکتی اور یہ کہ ایران بیرونی ممالک کی مدد کے بغیر اپنا تیل دریافت کر سکتا ہے۔ نکال سکتا ہے، صاف کر سکتا ہے، فروخت کر سکتا ہے۔ برطانیہ سے مسٹر سٹوک کا مشن آیا۔ اسے دھتکا دیا۔ پھر مسٹر ہیری مین کا مشن آیا۔ اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ کسی آزاد عدلیہ یا چرچل یا ٹرومین یا عالمی بنک یا آئزن ہاور یا کسی کی بھی مداخلت یا مشاورت کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنے ہی منفی جذبات کے سیر تھے اور کسی کی کوئی معقول بات سننے کے روادار نہ تھے۔

دوسری طرف کہانی یہ ہوئی کہ جو ایک طویل زمانے سے ہمارے حصہ دار اور شریک کار تھے، وہ ہمارے حریف بن گئے۔ ہمارا اشارہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی طرف ہے جس نے کمپنی کے دروازے بند کر دیئے اور تالا بندی کر دی۔ حکومت کو جو کرائے وغیرہ ادا کیے جاتے تھے۔ فوراً موقوف کر دیئے گئے اور تیل کی فروخت پر ہر طرح کی پابندی عائد کر دی۔ ایک قطرے کی بھی خرید و فروخت پر ہر طرح کی پابندی عائد کر دی۔ ایک قطرے کی بھی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔

آبادان ہمارا تیل کا سب سے بڑا کارخانہ تھا۔ وہاں پیداوار روک دی گئی۔ ہماری نئی کمپنی یعنی نیشنل ایرانی کمپنی اگرچہ تیل کے وسیع ذخائر کی واحد مالک قرار دے دی گئی تھی لیکن اس کے پاس نہ کارگیر تھے، نہ ماہر، نہ نقل و حمل کے ذرائع، نہ تقسیم و فروخت کے وسائل۔ معاملہ بین الاقوامی عدالت (ہیگ) میں پیش ہوا۔ ہماری توقعات کے بالکل برخلاف برطانوی جج نے ہمارے حق میں فیصلہ سنایا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ روس کے جج عدالت میں حاضر ہی نہ ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر مصداق کے وزیر اعظم بننے کے صرف دو ماہ بعد برطانیہ نے ایک بحری جنگی جہاز "ماریش" آبادان بھیج دیا، فوجی دستے عراق ایران کی درمیانی سرحد پر لگا دیئے اور چھاپہ بردار قبرص میں

ہم تہران واپس لوٹ آئے، جہاں اہل وطن نے انتہائی محبت اور جوش وخروش سے ہمارا فقید المثالی استقبال کیا۔ ایران کے چپے چپے، گلی گلی سے لوگوں کے پرمسرت نعرے سنائی دے رہے تھے جب ہم تہران سے رخصت ہوئے تھے تو ہمارے حیثیت ایک موروثی بادشاہ سے زیادہ نہ تھی لیکن اب جب واپس آئے تو ہم بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ ہم عوام کے منتخب نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو ہمیں تین دن کے اندر اندر حاصل ہو گیا۔ عدالت کے روبرو ڈاکٹر مصدق کے خلاف مقدمہ چلا تو یہاں بھی انہوں نے خواب اداکاری دکھائی، کبھی ہنستے، کبھی ہنساتے، کبھی رونے لگتے اور اپنی حالت قابل رحم بنا لیتے، من گھڑت کہانیاں سناتے، رویہ بھی بالکل احمقانہ بلکہ جاہلانہ تھا۔ ڈراما پیدا کرنے کے وہ زبردست ماہر تھے، عالمی اخبارات کے سامنے انہوں نے خود کو ایک تماشا بنا لیا۔ ان کی والدہ کا تعلق چونکہ قاچاریوں سے تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ ان کے دل میں پہلو خاندان کے لئے بغض یا حقارت یا غصہ ہو۔ بہر حال خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا شخص تھا۔ عدالت عالیہ نے غداری اور بغاوت کے الزام میں انہیں سزائے موت سنائی۔ ہم نے اپنے بیان میں عدالت کے روبرو صفائی قلب کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ ہماری ذات کے خلاف انہوں نے جو بھی اقدامات کئے ہیں ان کو خاطر میں نہ لایا جائے۔ ابھی انہوں نے تین سال کی قید ہی بھگتی تھی کہ رہا کر دیا گیا تہران کے مغرب میں احمد آباد کے مقام پر ان کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ وہاں چلے گئے اور بقیہ عمر خاموشی اور سادگی میں گزاری۔ ۱۹۵۷ء میں وفات پائی۔ عدالت میں جو مقدمہ چلا، اس کی کارروائی سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے زمانے کے واقعات پر عجب روشنی پڑی۔ مثال کے طور پر معلوم ہوا کہ جب ڈاکٹر مصدق نے ۱۹۵۱ء میں وزارت دفاع کا چارج لیا تھا تو اس وقت ۱۱۰ آفیسر تودہ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور دو سال بعد جب ۱۹۵۳ء میں ان کا زوال ہوا تو اس پارٹی کے ۲۴۰ آفیسر فوج میں شامل تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے منصوبے کے مطابق ڈاکٹر مصدق کو محض ہمیں کچلنے اور راہ سے ہٹانے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ تو دہ پارٹی کے دفتر سے جو دستاویزات اور کاغذات دستیاب ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ ہماری روانگی کے دو ہفتے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو بھی ختم کرنے کا پروگرام تھا۔ ہم نے خود ڈاک کے چھپے ہوئے ٹکٹ دیکھے ہیں جن پر ''پیپلز ایرانین ری پبلک'' لکھا ہوا تھا اور یہ جمہوریہ ہماری روانگی اور ڈاکٹر صاحب کی رخصتی کے قائم ہونی تھی لیکن ہماری واپسی پر عوام نے بیک آواز ہو کر جس شاندار انداز میں ہمارا والہانہ استقبال کیا، اس سے سازشیوں کے مذموم ارادوں پر اوس پڑ گئی۔ تو دہ پارٹی کو جب یہ احساس ہوا کہ عوام ان کے ساتھ نہیں ہیں تو وہ زیر زمین چلی گئی۔ یاد رہے کہ چند ماہ پہلے روس کے مرد آہن سٹالن کا انتقال ہو گیا تھا اور روس کے حکمت عملی میں چند اہم اور بنیادی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ تو دہ پارٹی کو روس کی مکمل سیاسی اور اقتصادی امداد حاصل تھی۔ ڈاکٹر مصدق کو برطرف کرنے میں برطانیہ اور بالخصوص امریکہ نے بہت حصہ لیا۔ اس بات کے تحریری ثبوت موجود ہیں کہ اس زمانے میں سی آئی اے نے ساٹھ ہزار ڈالر سے زیادہ کی رقم صرف کی۔ اہل ایران کو دیکھنے اور سمجھنے میں ڈاکٹر مصدق محض ایک مداری ہے اور یہ ملک وقوم کو تباہ کر کے رکھ دے گا، پورے تیس ماہ کا عرصہ لگا اگست کے آخر میں وہ بیشک برسر حکومت نہ رہا تھا اور معزز شہری اب پھر دیانت شرافت کے ساتھ امن وامان سے زندگی بسر کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے، پھر بھی ملک حقیقت میں تباہ ہو چکا تھا۔ اس کا بال بال قرضے میں بندھ چکا تھا۔ ہم غیر ممالک کے کروڑوں ڈالر کے مقروض تھے۔ معیشت تباہ حال تھی، خزانہ خالی پڑا تھا اور قوم کے تین سال بری طرح برباد ہو چکے تھے۔ تیل کا مسئلہ کیونکہ حل ہوا، جو ہمارے ملک کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اس کا ذکر ہم آئندہ باب میں کریں گے۔

تیل سے ایٹم تک

یاد رہے کہ جنوبی ایران میں تیل کا پہلا کنواں داریوس اعظم (۵۴۸۔۴۸۶ ق م) نے کھدوایا تھا۔ پچیس صدیوں کے بعد اسی علاقے میں جدید طرز کے کنوئیں سے تیل پانی کی طرح بہہ نکلا۔ تیل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بعض موجودہ اقوام کی زندگی میں اس نے حشر خیز ہنگامے برپا کیے ہیں۔ سازش، شورش، بغاوت، سیاسی ہلچل، معاشی بحران، دہشت گردی، فوجی بغاوت اور خونریز انقلاب آئے۔ ایران میں جو قیامت خیز واقعات ماضی قریب میں رونما ہوتے رہے ہیں اور جو اب بھی ایران کو تہ وبالا کیے ہوئے ہیں، وہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتے جب تک تیل سے متعلق وسائل ومسائل کا گہرا مطالعہ اور صحیح فہم نہ ہو۔

تیل کی کہانی انتہائی غیر انسانی اور غیر اخلاقی کہانی ہے۔ یہاں انسان کے تمام اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصول دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اگر طاقتور آئل کمپنیاں اب ہمارے ملک کا مذاق نہیں اڑاتیں اور توہین آمیز رویہ اختیار نہیں کرتیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے کارپردازان میں انسانیت کی رمق پیدا ہو گئی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے وہ جنگ جس کا آغاز اس صدی کے اوائل میں ہو گیا تھا، بڑی محنت اور قربانی کے بعد جیت لی ہے۔

چھ سال پہلے ہم نے بار بار کہا تھا کہ تیل کی صحیح قیمت مقرر کرنا ترقی یافتہ ممالک کے اپنے مفاد میں ہے۔ درجہ بدرجہ قیمت بڑھتے بڑھتے وہ سطح آ گئی کہ تیل توانائی کے دیگر مہنگے وسائل کی قیمتوں کے برابر آ گیا۔ معاشی طور پر قدرتاً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ توانائی کے عالمی ذخائر پر مناسب توجہ دی جائے گی۔ اس طرح ہم قیامت خیز خلا سے بچ گئے ہیں اور اب ہم ''کبھی ختم نہ ہونے والی توانائی'' کے دیگر وسیلے کی دنیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ خواہ وہ ایٹمی ہو یا شمسی یا آبی۔ اس کے برعکس سستے تیل کی پالیسی کا مطلب ہے ضیاع اور ناکارگی کی پالیسی جس کے تحت تیل کے ذخائر وقت سے پہلے ختم ہو جائیں گے اور اس کا ایک ہی مطلب ہوگا یعنی عالمی معیشت کی تباہی۔

صحیح قیمت پر تیل فراہم کرنے کی پالیسی میں امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وقتاً فوقتاً قیمتوں پر نظر ثانی کی جاتی رہے۔ نیز یہ کہ تیل استعمال کرنے والے ممالک کا تعاون بھی برابر حاصل ہوتا رہے۔ تاکہ بین الاقوامی قیمتوں میں افراط زر کا چکر پیدا نہ ہو پائے۔ ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً کانفرنسیں منعقد ہوں، بحث مباحثے ہوں، مذاکرات ہوں اور سوچ سمجھ کر اتفاق رائے سے نہ صرف تیل کی بلکہ اس توانائی کی بھی قیمت مقرر کی جائے جس پر کہ مستقبل کی صنعت وحرفت اور عالمی معیشت کا دارومدار ہوگا۔ اس امر کا تفصیلی جائزہ ہم بعد میں لیں گے کہ آنے والے زبردست عالمی معاشی بحران سے بچنے کے لئے، جو بڑے صنعتی ملکوں اور تیسری دنیا کے ملکوں پر خطرے کی تلوار بنا کھڑا ہے۔ ہم نے کیا کیا حل پیش کیے تھے۔ یہاں صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ ذرائع ابلاغ سے چلائے جانے والے پروپیگنڈے کے ذریعے دنیا کو یہ تو بتایا گیا کہ ہم نے تیل کی قیمتوں کو بڑھا کر بے انصافی کی ہے اور دنیا کو معاشی بحران کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ لیکن یہ بات چھپالی گئی کہ ہم نے تیل استعمال کرنے والے ملکوں کو اصلاح احوال کے لئے کیا کیا تجاویز پیش کی تھیں۔ اور اب صورت حال کیا ہے؟ فرانس کا مشہور اخبار ''لی اندے'' جو اس وقت ہماری ذات اور ہماری پالیسی کے خلاف بڑھ چڑھ کر حملے کیا کرتا تھا۔ اس نے اب مارچ ۱۹۷۹ء میں اپنے غیر ملکی خصوصی ضمیمے میں ایک طویل مضمون شائع کیا جس کا عنوان ہے۔ ''تو انائی کا بحران اور تیل کی قیمت۔''

یہ مضمون تہران کانفرنس کے ٹھیک پانچ سال اور تین ماہ بعد شائع ہوا۔ اس میں تیل کی حقیقت پسندانہ قیمت کے حق میں بالکل وہی دلائل دیئے ہیں جو ہم نے کانفرنس میں پیش کیے تھے۔ مضمون نگار خاتمہ کلام یوں کرتا ہے۔ اقوام عالم نے ''ضرورت'' کے مسئلے کی اہمیت کو بہت دیر سے سمجھا ہے۔ ہم نے بھی یہی کہا تھا کہ ہر شخص کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جلد یا بدیر تیل کی قیمت میں اضافہ گزیر ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ قیمت میں اضافہ بتدریج اور مرحلہ وار ہوتا کہ عالمی معیشت کو یکایک اور شدید جھٹکے نہ لگیں۔ اس مضمون میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ دنیا میں سالانہ تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار ملعب میٹر گیس فضول جلائی جاتی ہے۔ اس میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ فروخت پر جو ٹیکس لگایا جاتا ہے وہ لاگت سے بھی زیادہ ہے۔ مضمون میں یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک بین الاقوامی معاہدے کی فوری ضرورت ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ مضمون نگار نے اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ یہی دلائل ہم نے اپنی سعد آباد کی پریس کانفرنس میں دیئے تھے۔ مضمون نگار نے اپنے دلائل کی عمارت کونٹ نظل آئل کمپنی کی شائع کردہ ایک کتاب کی بنیاد پر کھڑی کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک بیرل تیل کی قیمت ۱۹۷۵ء میں ۲۴ ڈالر سے بڑھا کر ۲۷ ڈالر کر دی جائے تاکہ متبادل توانائی کے پانچ ذرائع کی قیمتیں تیل کے برابر آ سکیں۔ پھر مضمون نگار نے سی آئی اے کی رپورٹ مطبوعہ ۱۹۷۸ سے جا بجا اقتباس اور حوالے دیئے ہیں۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فی بیرل تیل کی قیمت تیس ڈالر مقرر ہو تو دنیا بھر میں معلوم تیل کی ذخائر دوگنے ہو جائیں گے۔ کمپنیوں اور اداروں کے نام سنین اور تاریخیں یاد رکھے۔ ہم نے بھی تو یہی کہا تھا۔ اگست ۱۹۷۸ء میں مسٹر شلسنگر نے کہا تھا کہ تیل کی قیمت فی بیرل چالیس تا پچاس ڈالر بھی پہنچ سکتی ہے۔ جب ہم نے یہ کہا تھا تو اسے غیر متوازن اور شرمناک بلیک میل قرار دیا گیا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہمیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس شخص کو ختم کر کے جو عقل سلیم کی بنیاد پر اس پالیسی کی حمایت کرتا تھا، کیا عالمی معیشت کی درپیش خطرے ختم ہو گئے ہیں۔ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم صحیح تھے۔ ہماری غلطی یہ کہ ہمارے رائے درست تھی۔

۱۹۷۴ء میں تیل کے بارے میں جو نیا قانون وضع ہوا۔ وہ بھی ایسا نہیں تھا کہ ہمیں غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے دربار میں سرخروئی حاصل ہو سکتی۔ اس قانون کی روح یہ تھی کہ جو بھی غیر ملکی کمپنی ایران میں کاروبار کرے، اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ تیل کے خریدار کی ہونی چاہیے اور اس کے لئے یہی وہ نیشنل سوسائٹی سے معاہدہ کرنے کی پابند ہو۔ اگر نیا تیل کہیں سے نکل آتا ہے یا نئے کنوؤں کی کھدائی ہوتی ہے تو معاہدہ کرنے والی کمپنی تیل کی پیداوار شروع ہوتے ہی خود بخود ختم ہو جائے گی یعنی اس کا معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ اس سے دوسرا معاہدہ ہوگا جو کہ تیل کی خرید و فروخت متعلق ہوگا۔ نیشنل آئل سوسائٹی اس کمپنی کو بازار کی قیمت پر ایک خاص مدت تک تیل دینے کی پابند ہوگی ان سارے اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے نیشنل سوسائٹی نے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں تیل

پس ہماری ''جرائم'' میں ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ ہم نے چاہا تھا کہ ایران جلد از جلد، بر اوقت پڑنے سے پہلے پہلے تیل کے زمانے سے نکل کر ایٹم کے زمانے میں داخل ہو جائے۔ کیا ہمیں اپنے اس جرم پر اظہار ندامت کرنا چاہیے؟ معافیاں طلب کرنی چاہئیں۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں اچانک ایک انقلاب آیا اور ایک سال پہلے تک ہمارے جن منصوبوں کو جوش وخروش سے پسند کیا جاتا تھا۔ ان کو ''ناممکن'' قرار دیا جانے لگا۔ تہران میں پیرس کی طرز پر جو زمین دوز ریلوے بنانی تھی۔ اب کہا گیا کہ ناممکن ہے۔ ریلوے کو بجلی سے چلانا مقصود تھا۔ کہا گیا کہ یہ بھی ناممکن ہے۔ جنوبی صوبوں میں نئی سڑکوں کی تعمیر اور پرانی سڑکوں کی مرمت کا ایک بڑا منصوبہ شروع ہو گیا تھا۔ کہا گیا کہ ناممکن ہے۔ گیس کو بر سر استعمال لانے کیلئے جو عظیم الشان منصوبہ ہم نے اتنے شوق سے بنایا تھا۔ کہا گیا کہ یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔ ہم پر الزام لگایا گیا کہ یہ جو ہم نے چار ایٹمی پاور اسٹیشن قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو اس کے پیچھے ہمارے ذاتی مفادات یا ذاتی عزائم پوشیدہ تھے۔ چہ جنوب کیا یہ بات واضح نہ تھی کہ جب تک یہ پاور اسٹیشن تیار ہو کر چالو ہوں گے اس وقت تک ہم مر چکے ہوں گے؟ پھر ہمارے ذاتی مفادات کیا ہو سکتے تھے؟ یہ مسئلہ ذاتی مفادات کا نہ تھا۔ محض ایران کی مستقبل کی ضروریات کو محسوس کرنے کا مسئلہ تھا اچھے شریف، خوش عقیدہ لوگ، خوب جانتے ہیں کہ ہمارے ذاتی عزائم ایران کو دنیا کا ایک طاقتور، خوشحالی اور متحدہ توانا ملک بنانے آرزو کے سوا کچھ نہیں۔ ایرانی قوم کو ابھی سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کیلئے۔ سوچنے والا ایک شخص ان سے جدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس وقت وہ قوم زمنہ وسطی کے بھوتوں اور دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ ہمارے عزائم نہ تو فرشتہ صفت تھے نہ شیطانی ہم نے ان کی بنیاد ٹھوس حقائق پر رکھی تھی فقادیہ کہتے ہیں کہ ''ہم نے ایران کو تباہ کر دیا اور وقت کے پیچھے کی طرف لے گئے۔''

انقلاب سفید

انقلاب سفید کے ستون

ایران کی بقا کیلئے جدوجہد کرتے کرتے ۱۹۵۳ء ہمیں بیس سال ہو گئے تھے۔ پچھلے ابواب میں اس جدوجہد کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ مزید بیس سال اس جدوجہد میں لگ گئے کہ ایرانی ترقی اور خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو۔ یہاں ہم اس جدوجہد کے بڑے بڑے مراحل کا بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس پوری مدت کے دوران میں ہمارا ایک ہی نصب العین رہا ہے اور اسے ہم نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ برابر عیاں کرتے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ایران کو ایک جدید مملکت بنایا جائے۔ اپنے سچے روحانی اخلاقی ورثے کے تحفظ وترویج کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جدید مادی ضروریات وآسائشات بھی فراہم ہوں جو روئے زمین پر رہتے ہوئے ان کا بنیادی حق ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہم نے اپنے سامنے نصب العین رکھا ہے۔ اس کی مخالفت مفاد پرستوں کی جانب سے ضرور ہو گئی۔ ہم جانتے تھے کہ وہ بہت مضبوط اور طاقتور ہیں لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ ان کا وجود عوام کی غربت، جہالت اور ضعیف الاعتقادی کا مرہون منت ہے۔ جوں جوں لوگ تعلیم یافتہ اور خوشحال ہوں گے مفاد پرستوں کا وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔ بیرونی دباؤ، بد اقتصادی، سرکاری رقوم کے خرد برد اور بعض حکومتوں کی بد انتظامی اور نا اہلی کے باوجود، ہم اپنے نصیب العین اور مقصد کی بجا آوری پر بڑی سختی سے کاربند رہے۔ ریوالوروں کی گولیوں اور مشین گنوں کی بوچھاڑ بھی ہمیں مسلسل سینتیس سال تک اس مقصد سے برگشتہ خاطر نہ کر سکی۔

۱۹۴۳ء کے اوائل ہی میں حالانکہ اس وقت جنگ عظیم زوروں پر تھی اور ہمیں کچھ اندرونی مسائل کا بھی سامنا تھا۔ ہم نے اپنی قوم کے بنیادی امراض زوال کے بنیادی اسباب کو جڑ سے اُکھاڑ پھینک دینے کا عزم کیا اور اس کے لئے مندرجہ ذیل پانچ مقاصد اپنے سامنے رکھے۔

۱۔ ہر شخص کے لئے روٹی
۲۔ ہر شخص کے لئے مکان
۳۔ ہر شخص کے لئے کپڑا
۴۔ ہر شخص کے لئے صحت
۵۔ ہر شخص کے لئے تعلیم۔ یک بعد دیگرے جتنی حکومتیں آتی رہیں ان سب کو یہ پانچ بنیادی مقاصد یاد دلاتے رہے اور پھر بالآخر انقلاب سفید برپا کر کہ ان مقاصد کے باضابطہ نفاذ کا فیصلہ کر لیا۔ یاد رہے کہ ۱۹۶۰ء تک ہمیں فوج کی کمان کے سوا کوئی آئینی اختیار حاصل نہ تھا۔ جونہی ہمیں پارلیمنٹ کو منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہوا ہم نے مصدق کے زوال کے بعد یہی کوشش کی کہ جو بھی حکومت بنے وہ مخلص، سنجیدہ، ذمہ داری اور محب وطن ضرور ہو۔ مذکورہ بالا پانچ بنیادی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے درجہ بدرجہ مرحلہ وار تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے پروگرام کو آگے مزید آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی ہر مرحلہ پر حقیقی اور فوری ضروریات کی ترجیحات کا خیال رکھا۔ ہوتے

ADMIN

MUHAMMAD NADEEM

0331-6362354

ALL NEWS NETWORK

News Headlines . Daily News Papers .

Job Adds Daily.Sports Headlines .

Weather Update . Breaking News

Teachers r Great

Only Teachers & Educational

Material Allowed

PDF KI DUNIYA

Only PDF Allowed

حصہ نمبر 13

زرعی اصلاحات

ہم اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے پیشہ ور سیاست دانوں کی بالکل ضد ہیں۔ وہ ناممکن کے پیچھے دوڑتے ہیں اور ہم ممکن اور ناممکن کے درمیان فرق کرنا جانتے ہیں۔ اور یہ ہماری عین خوش قسمتی ہے۔ آئیڈیل اور چیز ہے مثلاً آزادی اور مساوات اور حقیقت اور چیز (مثلاً روٹی کپڑا اور مکان) ۱۹۴۱ء میں ہم نے اپنی نجی قابل کاشت اراضی حکومت کے حوالے کردی۔ خیال تھا کہ یہ زرعی انقلاب کے لئے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگی۔ لیکن اس وقت کی حکومت اپنی نا اہلی کے باعث اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاسکی۔ اسلئے ہم نے اراضی واپس لے کر براہ راست کاشتکاروں میں تقسیم کردی۔ معاملہ یہاں سے شروع ہوا تھا۔ لیکن درمیان میں ڈاکٹر مصدق آگئے اور معاملہ رک گیا ان کو زوال نصیب ہوا تو دوبارہ شروع ہوا۔ زرعی اصلاحات کا کام تین مرحلوں میں سرنجام پایا۔ اول یہ کہ کسی زمیندار کے پاس ایک گاؤں سے زیادہ کی نجی ملکیت نہ ہونا چاہیے۔ ہم نے کاشت کاروں کو قرضے دیئے جو پچاس سال میں آسان قسطوں میں قابل ادا تھے۔ انہوں نے اس قرضے سے زمینداروں سے ان کے (فالتو) گاؤں خرید لئے۔ بڑی بڑی زمینداریوں کو غیر قانون قرار دیا گیا زمینداروں کیا شک شوئی کے لئے انہیں ان کا حصہ اس طرح ادا کیا گیا کہ ان کو دی جانے والی رقم سرکاری کارخانوں میں لگادی گئی، جن سے انہیں منافع ملتا تھا۔

دوم:۔ جو زمیندار خود کاشت نہیں کرتے ان پر پابندی عائد کردی گئی کہ وہ قابل کاشت زمین یا تو کاشت کار کے ہاتھ فروخت کردیں یا اسے تیس سال کے لئے پٹے پر دے دیں۔

سوم:۔ جن زمینداروں نے اراضی پٹے پر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان پر مزید پابندی کہ وہ تو اپنی آمدنی میں کاشت کاروں کا حصہ دار بنائیں یا جو زمین وہ کاشت کررہا ہے، اس کا کچھ حصہ وہ اس کے ہاتھ فروخت کردیں۔ گویا اب بڑے بڑے زمینداروں کے پاس فقط بڑی بڑی بنجر اور غیر آباد زمینیں رہ گئی تھیں۔ جن کو قابل کاشت بنانے کے لئے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ جدید مشینیں استعمال کریں۔ ہم انسان پر انسان کے استحصال کے خلاف ہیں۔ لیکن مشین پر انسان کے استحصال کے حق میں ہیں۔

زرعی اصلاحات کے مسئلے کو ہم ریفرنڈم کی شکل میں عوام کی خدمت میں لے گئے۔ ہم نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا "ہمارا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بیس سال کے اندر اندر ایران کو تہذیب اور ترقی کی اس منزل پر لے جائیں۔ جہاں دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک براجمان ہوچکے ہیں۔ گزشتہ دس برسوں میں ہماری پسماندگی تقریباً آدھی ختم ہوگئی ہے یہ کام نسبتاً آسان تھا باقی جو آدھی پسماندگی رہ گئی ہے۔ اسے دور کرنا بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ ہم یہ زرعی اصلاحات کے مسئلہ آپ کی پسند ناپسند معلوم کرنے کے لئے براہ راست عوام کے سامنے اس لئے لائے ہیں تاکہ آئندہ کسی بھی شخص یا حکومت کو غلامی کا نظام دوبارہ لانے کی جرات نہ ہو جس میں ہمارے کسان کاشت کار صدیوں سے سسکتے چلے آرہے ہیں۔ تاکہ چند مٹھی بھر لوگ پوری قوم کے وسائل و ذرائع پر اپنے ذاتی مفاد کے لئے چھاپہ نہ مارتے رہیں۔ تاکہ کسی شخص یا چند اشخاص یا جماعت یا طبقے کے ذاتی مفادات ان انقلابی تبدیلیوں کے اثرات کو زائل یا تبدیل نہ کرسکیں۔"

جنوری ۱۹۶۳ء میں ریفرنڈم ہوا۔ نتائج حوصلہ افزا بھی تھے اور پر جوش بھی۔ لیکن چھ ماہ کے بعد ہی جنوبی ایران میں شورش کا سامنا کرنا پڑا۔ سبوتاژ ایک لہر تھی جس نے جلد ہی لوٹ مار اور خونی فسادات کا روپ دھار کو خود تہران کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تیل کے کنوئیں کھودنے کی بجائے آگ کھودنا ایک قومی مشغلہ بن کر رہ گیا۔ جلد یہ ثابت ہو گیا کہ اس باغیانہ تحریک کے پیچھے چند بڑے بڑے جاگیرداروں کا ہاتھ ہے۔ وہی تحریک کو چوری چھپے سرمایہ فراہم کررہے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی پوری پوری کوشش کے باوجود زرعی اصلاحات کے قانون کو نافذ العمل ہونے سے نہ روک سکے تھے۔ سرخ و سیاہ کا خاموش اتحاد تو ڈاکٹر مصدق کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا۔ سرخ سے ہماری مراد بائیں بازو کے کمیونسٹوں سے ہے۔ اور سیاہ سے مراد بائیں بازو کے رجعت پسند۔ لیکن اس وقت یعنی ۱۹۶۳ء تک "اسلامی سوشلزم" کی کوئی پیوندکاری تحریک باضابطہ طور پر سامنے نہ آئی تھی جون ۱۹۶۳ء کے فسادات خالصتاً دائیں بازو کی انتہا پسند سیاہ طاقتوں کے پیدا کردہ تھے۔ انہوں نے غارت گری اور غنڈہ گردی کی انتہا کردی۔ فسادات، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی شہ دینے والا ایک نامعلوم شخص تھا۔ جس کا نام آیت اللہ خمینی تھا، جو ہماری زرعی اصلاحات، آزادیٔ نسواں اور انقلاب سفید کے اصولوں کے سخت خلاف تھا۔ ملک میں اس کو نہ تو اثر و رسوخ حاصل تھا۔ نہ حمایت ہی حاصل تھی۔ اس کے حامیوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ ہم نے اسے نہ تو سزا دی، نہ اس پر مقدمہ وغیرہ چلایا۔ نہ احتساب کیا۔ فقط اتنی درخواست کی کہ ایران سے چلے جاؤ اور اپنی اشتعال انگیز خطابت کا زور کہیں اور جاکر دکھاؤ۔

جب زرعی اصلاحات کا عمل تیسرے مرحلے میں داخل ہوا تو اس وقت تک ملک میں بڑی بڑی زمینداریوں کا زور

حصہ نمبر 14

تعمیر و ترقی

یہ نا قابل تردید حقیقت ہے اور اس سے ہم شروع دن سے آگاہ تھے کہ انقلاب سفید کسی صورت میں بھی بڑے بڑے جاگیرداروں اور امراء کو پسند خاطر نہیں ہوسکتا اور یہ بھی نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ایران کی تعمیر و ترقی ہمارا واحد نصب العین تھا اور ترقی کا دارومدار صنعت و حرفت کی ترقی میں مضمر تھا۔ ادھر آبادی میں بھی انتہائی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ خوراک کے مسائل اسی حساب سے بڑھ رہے تھے۔ سب سے اہم ضرورت اس بات کی تھی کہ کارکنوں کے لئے مکان فراہم کئے جائیں۔ یہ انقلاب اصول کا نکتہ نمبر ۱۸ تھا جس پر ۱۹۷۷ء میں عمل کیا جا سکا۔ تعمیر مکانات کے منصوبے میں سرمایہ ضائع ہونے سے بچانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ حکومت خود مکان بنا کر دے، چنانچہ ہم نے قومی سطح پر پروگرام بنایا۔ نجی سرمایہ کاری کی ترغیب کے لئے قرضے کی سہولتیں پیدا کی گئیں۔ تمام بینکوں کی سرمایہ کاری سے ایک مشترکہ ''پراپرٹی بنک'' قائم کیا گیا۔ خاص قسم کے پراسپری نوٹ جاری کئے گئے۔ امداد باہمی کی انجمین اور دیگر تعمیراتی انجمین قائم کی گئیں۔ انقلاب سفید کا سولہواں اصول معاشرتی بہبود کے لئے مخصوص تھا۔ حاملہ عورتوں اور نوزائیدہ بچوں کی صحت کے لئے زور دیا گیا۔ ہر شہری کیلئے یہ ضروری قرار دیا گیا۔ کہ وہ تصدیق نامہ صحت حاصل کرے جس میں اس کی صحت نامہ کا تحفظ حکومت کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ معاشرتی تحفظ کے پروگرام کا مقصد وحید یہ تھا کہ محنت کشوں کو ہر قسم کے حادثے دکھ بیماری اور ناکارگی کے خطروں سے تحفظ دلایا جائے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا قانون دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی پسند اور موثر تھا۔ مثال کے طور پر بڑے سے بڑے ملک میں ریٹائرمنٹ پر ملنے والی پنشن تنخواہ کا ۵۰ تا ۶۰ فیصد ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں پنشن کی شرح سو فیصد تھی۔ انقلاب کا چوتھا۔ اصول (یعنی منافع کارکنوں کا حصہ) ۱۹۶۳ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ اور اتنا موثر اور ترقی پسند تا الغرن نیا کے کسی ملک میں نافذ العمل نہ تھا۔ ہر کمپنی کو کارکنوں کی یونین سے اجتماعی معاہدہ کرنا پڑتا تھا۔ جس کی رو سے ان کو پیداوار، بچت اور منافع کے مطابق حصہ دار بنایا جاتا تھا۔ صرف ۱۹۷۶ء میں سرکاری اور نجی سیکٹر میں ۱۵ لاکھ ۳۰ ہزار کارکنوں کو تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ریال۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کی تنخواہ کے برابر بطور حصہ منافع ملا تھا۔ تنخواہ دار ملازمین کو قرضے دینے کے لئے ایک خصوصی بنک قائم کیا گیا۔ جس نے مزید کئی سو کوآپریٹو بنک کی برانچیں قائم کیں۔ مکانات کی تعمیر یا مرمت یا قرضے وغیرہ اتارنے کیلئے یہ بنک کارکنوں کو فقط چار فیصد شرح سود قرضے جاری کرتے تھے۔ بہر صورت ہماری منتہائے یہ تھی کہ جمہوری مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اپنا اظہار معاشی مساوات کے ذریعے کرے اور وہ اسی طرح ممکن تھا کہ بالآخر ہر کارکن اپنے کارخانے یا فیکٹری یا کمپنی کا حصہ دار یا جزوی مالک بن جائے کیونکہ یہ سب چیزیں اس کی محنت و کاوش کی بدولت جاری و ساری ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۷۵ء میں انقلاب کا اصول نمبر ۱۳ ایک قانون بن کر سامنے آیا۔ جس کی رو سے صنعتی کارخانوں کی ملکیت میں کارکنوں کو قانوناً حصہ دار بنایا گیا۔ ہر نجی فرم جو پانچ سال سے زیادہ عرصے سے چلی آرہی تھی۔ اس پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ اپنے حصص کا ۴۹ فیصد اپنے اجیروں کے ہاتھ فروخت کرے سرکاری صنعتوں کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ اپنے حصص کا ۹۹ فیصد اپنے ملازمین اور دوسرے ضرورت مند فردوں اور کسانوں وغیرہ میں تقسیم کریں۔ اس پر آجر لوگ سیخ پا ہو گئے اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد کیفیت یہ ہوگئی کہ اکثر و بیشتر کارخانوں کے مالکان نے یہ برملا اعتراف کیا کہ کمپنی کو جتنا منافع اب ہونے لگا ہے۔ پہلے کبھی نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ انہوں نے ان نئی اصلاحات کی بنا پر کھویا کچھ نہیں، پایا بہت کچھ ہے۔

یہاں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ اس نئے قانون سے پیشہ ور کمیونسٹوں تو وہ پارٹی اور جارحیت پسند سرمایہ داروں کے منہ بند ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ اپنا پروپیگنڈہ کسی دلیل کی بنیاد پر چلائیں۔ ہم نے مزدوروں کاریگروں، ہنرمندوں، اجیروں اور آجروں، یعنی محنت اور سرمائے کے مابین تعاون، اشتراک، اتحاد اور استحکام کی ایک شاندار مثال قائم کر دی تھی۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ اس شاندار سکیم کی قسمت میں کامیاب ہونا لکھا تھا۔ یہ کس سے پوچھا جائے کہ کیوں؟

ایران کے مزدوروں اور کسانوں کی اقتصادی و معاشرتی حالت سدھارنے کے لئے ہم نے جو کچھ کیا یہ حقائق اس کی گواہی دیتے ہیں۔ دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔

انصاف

ایران میں انصاف کبھی نہیں رہا۔ کیونکہ یہاں ہمیشہ سے یہ دیکھا جاتا رہا ہے کہ ملزم امیر ہے یا غریب، والد صاحب سے قبل یہاں انصاف ملاؤں کے ہاتھ میں تھا۔ والد صاحب نے ایران کو ایک عدالتی نظام دیا لیکن ایک تو وہ نپولین کے طرز انصاف پر ہونے کے باعث سیکولر تھا۔ دوسرے دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک کی طرح وہ نظام تمام

حصہ نمبر 15

نظم و نسق کی اصلاح

بیوروکریسی جسے خدائی تازیانہ کہنا چاہئے، ہمارے ملک ایران میں ایک باقاعدہ ادارے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ ہم نے انقلاب سفید کی شق نمبر ۱۲ نظم و نسق کی اصلاح کے لئے وقف کی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس میدان میں ہمیں مختلف چہروں والے بھوت کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جس کے ایک ہاتھ میں فائلوں کا انبار ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبا سا سرخ فیتہ۔ ہم نے ایک ایسے حلقے میں دانشمندانہ اور اخلاقی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا جو تبدیلی کا پہلا دشمن ہے۔ ہمارے خیال میں انتظامیہ ملک کی خدمت گزار ہوتی ہے۔ سرکاری ملازمین کو عوامی فلاح و بہبود کا خیال چاہئے اور اپنی ذمہ داریوں کو دیانت خوش اسلوبی اور فرض شناسی سے انجام دینا چاہیے لیکن تبدیلی دونوں طرف سے ہونی چاہیے۔ یعنی انتظامیہ کا رویہ عوام کی جانب اور عوام کا رویہ انتظامیہ کی جانب بدلنا چاہیے۔ اصلاحات کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ انتظامیہ پر کام کا دباؤ پڑ رہا تھا۔ آبادی میں اضافے ترقی کی رفتار اور مرکزیت کے باعث نظم و نسق پیچیدہ بھی ہو رہا تھا اور گراں بار بھی پرانے محکمے شاخ در شاخ ہو رہے تھے اور نئے نئے محکمے خود بخود وجود میں آ رہے تھے۔ ہمیں مشکلات کا اندازہ تھا۔ برائیوں کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ یہ تھا کہ انہیں جڑ سے کاٹا جائے اس لئے انتظامی اصلاحات کو تعلیمی اصلاحات سے وابستہ رکھا گیا۔ یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم اور تربیتی کالجوں کے نصاب میں نظم و نسق کو بطور درس شامل کیا گیا۔ ہر شخص کے لئے انتظامی امور کا جاننا ضروری قرار دیا گیا۔ انتظامی اصلاحات پر سختی سے کاربند رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۸ء تک یہ عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ بیوروکریسی زور ٹوٹ گیا ہے۔ بھوت نے اصلاحات کی ضربوں سے بلبلا کر گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ کبھی تو ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھ لیتا اور کبھی روایت پرستی کا خول اپنے اوپر چڑھا لیتا۔

سرکاری رقوم کا غبن، رشوت ستانی، بدعنوانیاں ایک عرصے سے ہماری معاشرے کا شعار بن گئی تھیں۔ ان کی اصلاحات کے لئے ہم نے اس ضرب المثل پر عمل کیا کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ ۱۹۵۹ء میں شاہی معائنہ ٹیم نے جو طریقہ شروع کیا گیا تھا اسے ۱۹۷۶ میں ختم کر کے شاہی احتسابی کمیشن کے عنوان سے موثر طریقے سے شروع کیا گیا۔ اس میں انتظامی کونسلوں ''سیاسی پارٹی چیمبر آف کامرس، محکمہ صنعت، محکمہ کان کنی اور ذرائع ابلاغ کے نمائندے شامل تھے۔ اس کمیشن نے مختلف وزارتوں کے پروگراموں اور منصوبوں کا بنظر غائر جائزہ لیا اور ان کے کاموں کے معیار اور رفتار کی سخت نگرانی کی غلطیوں کا کا انسداد، غلط، روی کی روگ تھام، غفلت و لاپروائی کا خاتمہ، اصلاحات نافذ کرنا اور جہاں ضروری ہو، مناسب سزا دینا۔ اس کمیشن فرائض میں شامل تھا تو قع کے عین مطابق مغربی پریس کے مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود اس کمیشن کی خدمات سے مفید نتائج برآمد ہوئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بیوروکریسی راہ راست پر آ گئی اور خدمت عوام کا سبق اسے پوری طرح یاد آ گیا البتہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا احساس ضروری ہو گیا کہ راہ راست پر آنے ہی میں عافیت اور خیریت ہے اور ثواب بھی۔

آزادی نسواں

کسی بھی عظیم تہذیب کے دیناوی و دنیوی و مادی روحانی پہلوؤں کے اعتبار سے خواتین کے اخلاق و عملی داریاں کسی بھی لحاظ سے مردوں سے کم نہیں۔ خاص طور پر اسلامی معاشرے میں ''ماں'' کو جو معزز و خاص مقام حاصل ہے، اس کو ہمہ وقت مدنظر رکھنا چاہئے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے اور عقل سلیم بھی یہی کہتی ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر سیاسی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ چنانچہ انقلاب سفید کی شق نمبر ۵ عورتوں کی آزادی اور مساوات اور حقوق کے لئے مختص کی گئی۔ ہمارے انقلاب سفید سے پہلے انتخابی قوانین کی شق نمبر ۱۰ کی عبارت قابل ذکر ہے۔

''مندرجہ ذیل کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کیا جاتا ہے: خواتین وہ جو ابھی کسی سرپرستی میں ہیں اور قانوناً اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوئیں۔ دیوالیہ لوگ فاتر العقل۔ بھکاری۔ وہ لوگ جو اپنی روزی غیر معزز ذرائع سے کماتے ہیں۔ مجرم، چور، بدمعاش اور بدکردار جو شریعت اسلامیہ کی خلاف روزی کماتے ہیں۔'' گویا واضعین قانون کی پست ذہنیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کو پاگلوں، بھکاریوں اور مجرموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ ہرگز ہرگز قرآن مجید کا دیا ہوا اصول نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں عورتوں کو جو حقوق حاصل ہیں، وہ کسی بھی مذہب یا تحریک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر انہیں ہمیشہ سے یہ حق رہا ہے کہ وہ اپنے روپے پیسے اور جائیداد کو خود اپنے کنٹرول میں رکھ سکتی ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنی جہالت اور قدامت پسندی سے معاشرے میں عورتوں کے مقام و مرتبے کو اپنی اپنی تاویل کے مطابق غلط طور پر دین اسلام سے وابستہ کر رکھا ہے۔ ہمارے دین میں عورت کا مقام کچھ اور ہے اور ان لوگوں کے ذہن میں کچھ اور۔ پس ہم نے عورتوں کی آزادی کے باب میں جو ظلم و ستم روا رکھا جاتا تھا، ان کے ساتھ جو بے انصافیاں اور

ہماری خارجہ پالیسی

اندرون ملک ہماری جو بھی داخلہ پالیسی، مقاصد اور خدمات تھیں، ان کا ذکر ہو چکا ہے ہماری خارجہ پالیسی کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ ایران کے اردگرد جو ہمارے پڑوسی ممالک آباد ہیں۔ ان سے خصوصی قریبی خوشگوار تعلقات قائم رکھے جائیں۔ چنانچہ اس جذبے سے ہم نے روس کے ساتھ اپنے سرحدی تنازعات طے کیے۔ دریائے آراس کے پانی کی تقسیم بین الاقوامی قانون کے مطابق ہوئی۔ برابری کی اساس پر ہم نے اس دریا پر ایک بہت بڑا بند باندھا، جس سے بجلی بھی پیدا ہوئی اور وسیع رقبے کی آبپاشی بھی ہوئی۔ پانی بجلی کا ایک ایسا ہی دوسرا منصوبہ زیر تجویز تھا جس سے دس لاکھ کیلووواٹ بجلی فراہم ہوتی۔ روس سے ہماری تجارت بہت زیادہ تھی۔ ہم اسے قدرتی گیس فراہم کرتے تھے اور روس ہمارے لئے اصفہان میں ایک بہت بڑی اسٹیل مل بنا رہا تھا۔ آئزن ہاور کے زمانے میں امریکہ سے اس کارخانے کی بات چلی تھی لیکن معاملہ مذاکرات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ روس نے خراساں کے جنوب میں اور کرمان کے قریب تیل اور کوئلے کی تلاش میں ہماری بہت مدد کی۔ مغربی یورپ سے ہماری تجارت روس ہی کے راستے ہوتی تھی۔ یاد رہے کہ ہم روس سے لاکھوں روبل کا ہلکا لیکن شاندار فوجی ساز و سامان خریدا کرتے تھے۔ چیکو یہ بھی یاد رہے کہ مشرقی یورپ کے دوسرے اشتراکی ممالک کی طرح چیکوسلواکیہ میں بھی جب ہم وہاں گئے ہمارا شاندار استقبال کیا گیا۔ چیکوسلاوکیہ، بلغاریہ، پولینڈ، ہنگری اور رومانیہ کے تقریباً سبھی سرکردہ رہنما ہمارے ذاتی دوست تھے۔ خاص طور پر ہم اپنے دوست چسکو کی ملاقاتیں اور ان کا مہربانہ سلوک کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ایران سے ہماری رخصتی کے بعد بھی ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ترکی سے ہمارے تعلقات ہمیشہ دوستانہ اور برادرانہ رہے ہیں۔ جب سے ہمارے والد محترم وہاں دورے پر گئے تھے اس وقت سے لے کر اب تک دوستی کے رشتے میں معمولی سی بھی رخنہ اندازی نہیں ہوئی۔ ہم بغداد پیکٹ میں شریک تھے ہمیں یاد ہے کہ معاہدہ بغداد پر دستخط کرنے کے چند ہی روز بعد ہمارا ماسکو جانا ہوا۔ خروشچیف صاحب ہم سے ناراض تھے۔ انہوں نے ہمارا استقبال ان الفاظ کے ساتھ کیا۔ یہ ایک جارحانہ معاہدہ ہے جو ہمارے خلاف کیا گیا ہے۔ ہم نے ان سے عرض کیا۔ سیاسی اور صحافتی میں حلقوں کا ایک دفاعی لائن کے آجکل بہت چرچے ہیں جو کوہ زاگروس سے گزرتی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ سلسلہ کوہ روس میں واقع ہے؟۔

''بولے۔ نہیں۔ ایران میں ہے۔''

''پھر تو یہ معاہدہ دفاعی ہوا، جارحانہ کیسے ہوا۔'' ہم نے جواب دیا۔

خروشچیف اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے، کہنے لگے۔ ''اپنے ان معاہدوں سے ہم سے مذاق نہ کرو۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم صرف سات ایٹم بموں سے برطانیہ کا اور بارہ بموں میں ترکی کا دھڑن تختہ کر سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ایک مہمان سے اس انداز تکلم کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دیکھ لینا، یہ معاہدہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ پچیس برس کے بعد ثابت تو یہی ہوا کہ معاہدہ بغداد صابن کے جھاگ ہی کی طرح بیٹھ گیا۔ ۱۹۷۵ء الجزائر میں تیل کے بارے میں جو مشہور عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ہمیں عراق کے صدر صدام حسین سے ملاقات کا موقع ملا۔ باہمی گفتگو کے بعد ہم دونوں نے اتفاق کیا کہ یہ پرانے جھگڑے اب ختم ہو جانے چاہئیں اور ان بڑی استعماری طاقتوں نے ایک زمانے سے ہمارے درمیان جو تنازعے کی ہڈی پھینک رکھی، اسے اٹھا پھینک دینا چاہئے۔ صدر صدام نے شرق العرب کے مسئلے کو مروجہ بین الاقوامی قانون کے مطابق حل کرنے سے اتفاق رائے ظاہر کیا۔ دریائے آراس کی طرح اس معاملے میں بھی طے پایا کہ پانی ایران اور عراق کے مابین بیچوں بیچ تقسیم کر لیا جائے۔ ہم نے صدر صدام کو بڑے خلوص سے یقین دلایا کہ ایران کی سلامتی کا دارومدار عراق کی سلامتی اور خوشحالی پر ہے۔ افغانستان سے بھی ہمارا رشتہ بھائی چارے کا ہے۔ اقتصادی بحرانوں کے زمانے میں ہم نے ہمیشہ اس کی مدد کی ہے۔ اچانک وہاں حکومت بدل گئی اور سیاسی نقشہ کچھ اور ہی ہو گیا۔ مغربی طاقتیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ کیونکہ اس تبدیلی کا ان پر براہ راست اثر نہ پڑا تھا۔ ہم نے فوراً نئی حکومت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اپنی اقتصادی امداد برابر جاری رکھی۔ لیکن ہماری یہ حیرت بھی برابر قائم رہی کہ مغربی طاقتوں نے ایران کی طرف سے آنکھیں کیوں پھیر لی ہیں اور وہ یہ کیوں نہیں دیکھ رہیں کہ افغانستان میں اس زبردست تبدیلی کے ایران پر کیا اثرات و نتائج برآمد ہوں گے۔ کیا بڑی طاقتوں نے ہماری خطے کے بارے میں اپنی پالیسی بدل لی ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو اس کی آزادی کے بعد کسی ملک کا پہلا سربراہ جس نے وہاں کا دورہ کیا، وہ ہم تھے ہم ہمیشہ اس نئی جمہوریہ کے باوفا اور با اعتماد دوست رہے ہیں۔ معاشی اور فوجی لحاظ سے ہم نے ہمیشہ اس کی مدد کی ہے لیکن ہم نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان اور بھارت کے درمیان پر امن دائمی خوشگوار تعلقات

اس کے باوجود ہم یہی کہیں گے کہ وہ عظیم لیڈر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے فاتح چرچل نہیں، سٹالن تھے۔ تہران، مالٹا اور آخر میں پوٹسڈم کے مقامات پر جو اتحادی طاقتوں کی کانفرنسیں ہوئیں۔ ان میں اصل قوت متحرکہ سٹالن کی شخصیت تھی۔ عالمی امن جو گزشتہ پینتیس سال سے چلا آ رہا ہے، وہ سٹالن ہی نے نافذ کیا تھا۔ یہاں چونکہ ہم روس سے اپنے تعلقات کا ذکر کر رہے ہیں، اس لئے یہ بتانا مقصود ہے کہ سٹالن کے جانشینوں نے بھی ہمیں مایوس نہیں کیا۔ سب کو معلوم ہے کہ ہمیں کمیونزم کے عقیدے سے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں۔ ہم نے اپنے عہد حکومت میں کمیونزم کے خلاف مسلسل لمبی لڑائی لڑی ہے۔ ہمیں احساس تھا کہ اس لڑائی میں زبردست خطرے پنہاں ہیں، لیکن ہم نے خطرے کو مول لینا پسند کیا مگر کمیونزم سے مفاہمت نہ کی۔ بالآخر ۱۹۵۶ء میں جب ہم نے ماسکو کا پہلی بار دورہ کیا تو اختلاف کے بادل چھٹے۔ معاہدے بغداد پر دستخط کے چند ہی روز بعد ہماری ملاقات خروشچیف سے ہوئی۔ وہ بہت درشت، سخت ضدی اور مشکل آدمی تھے۔ لیکن چونکہ کسان تھے۔ دیہاتی تھے اس لئے شریف النفس تھے۔ دل کے صاف اور کھرے تھے اور اسی بنا پر ہمیں ناپسند نہ تھے۔ ہم نے باہم اتفاق کیا کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہنا چاہیے۔ مسٹر برزنیف سے ہماری ملاقات ماسکو میں بھی ہوئی اور ایران میں بھی ہوئی ہمارے مذاکرات کا موضوع ہی جھگڑا لو تھا، اس لئے دونوں طرف کھنچاؤ کی کیفیت تھی۔ پھر بھی ان کی یادیں خوشگوار ہیں۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود ہم دل سے ان کے قدردان ہیں۔ وہ اپنے ظاہر و باطن میں ایک غیر معمولی ڈپلومیٹ ہیں۔ وہ پر امن بقائے باہمی پر یقین رکھتے ہیں۔ روس جو آج بھی طاقت وسطوت کا مالک ہے، وہ برزنیف کی مرہون منت ہے۔ دنیا بھر میں جوہری توانائی میں نمبر ایک، بحری طاقت میں نمبر ایک، فضائی طاقت میں نمبر ایک.... ان کی برتری ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ صدر روزملیٹ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ان سے ہماری ملاقات روسی سفارت خانے میں ہوئی تھی۔ انہوں نے پہلی ملاقات ہی میں ہم سے بڑی انکساری سے کہا کہ صدرات سے سبکدوشی کے بعد وہ چاہیں گے کہ ایران میں جنگ کاری کی مہم میں انہیں ایک ماہر کے طور پر لیا جائے۔ ہم ان کی زبان سے یہ سن کر ششدر رہ گئے۔ امریکا کا صدر اور ہم سے ملازمت کی درخواست کرے۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ایران میں ہم جنگل کاری کے بارے میں زبردست اصلاحات کرنے والے ہیں۔

مسٹر چرچل سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ماسکو جاتے ہوئے تہران رکے تھے۔ ہم نے جنگ کے مضمرات پر تفصیل سے گفتگو کی۔ ایک اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود ہم نے سیاسی اور فوجی امور میں بزعم خویش اپنے مشورے دیے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ اتحادی طاقتوں کو یورپ پر اس کے کمزور ترین حصے یعنی جنوب کی طرف سے حملہ آور ہونا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ اٹلی اور بلقان حملہ شروع کرنے کیلئے موزوں رہیں گے۔ اپنی کرسی میں بیٹھے، اپنا سگار ہونٹوں میں دبائے، اپنی بڑی بڑی چمکدار ذہین آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے وہ ہماری باتیں دلچسپی سے سنتے رہے۔ جب ہم نے اپنی باتیں ختم کر لیں تو وہ خاموش رہے۔ ایک فقرہ بھی نہ کیا۔ لیکن ایک مدت کے بعد جب ہم نے ان کی خودنوشت کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ ہم نے تہران میں جو مشورے دیے تھے، وہ انہیں پسند آئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے سخت بحرانی زمانے میں مسٹر چرچل نے اپنے ملک کی شاندار قیادت کی۔ اس کے بعد بھی ان سے ہماری متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک روز جب، ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ پر ان کے ہمراہ لنچ پر تھے اس وقت وہ دوبارہ وزیر اعظم بنے تھے۔ تو ان کی بیگم نے ہم سے پوچھا۔ ''آپ کو کیا خیال ہے کیا ان کا موجودہ معیار ختم ہونے کے بعد ''بزرگ سیاستدان'' کے طور پر فال سیاسی زندگی بسر کرنی چاہیے، یا ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ ہم نے کہا۔ ''سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ اس لئے کہ ونسٹن چرچل کا وقار بطور وزیر اعظم اور بطور فاتح سیاست دان تاریخ میں لکھا جا چکا ہے۔ بس اتنا کافی ہے۔'' جب ہم امریکہ کے مشاہیر کی طرز دیکھتے ہیں تو آئزن ہاور، رچرڈ نکس، ایورل ہرمن، ٹرومین اور لنڈن جانسن کے نام سامنے آتے ہیں۔ تاریخ میں آئزن ہاور کا نام ایک عظیم سپاہی کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔ وہ بنیادی طور پر شریف النفس تھے اور جانتے تھے کہ اہل امریکا کن اخلاقی اوصاف کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ہم خود بھی ان کو بہت چاہتے تھے۔ ان کو وفات کی خبر سنی تو ہمیں بہت صدمہ ہوا۔ ہم نے ان کی جنازے میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ہم ان کے نوازشات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں ڈاکٹر مصدق کی پالیسی کے خلاف علی الاعلان ہماری حمایت کی۔ اس زمانے کی امریکی خارجہ پالیسی، جس کے معمار فاسٹر ڈلس تھے، بہت مضبوط اور تیسری دنیا کے حق میں مفید اور پائیدار تھی۔ ۱۹۵۳ء سے تا حال رچرڈ نکس سے ہمیں ذاتی دوستی کا شرف حاصل ہے۔ اس وقت وہ آئزن ہاور کے نائب صدر تھے۔ نکسن کے زمانے صدارت میں امریکہ سے ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہو گئے، جو صدر فورڈ کے عہد تک قائم رہے۔ تعلقات خارجہ کے معاملے میں نکس صاحب بصیرت اور صاحب نظر آدمی ہیں۔ مردم شناس بھی ہیں اور واقعات و حالات کی

حصہ نمبر 18

شاہی جمہوریت

ایک روز والد بزرگوار نے ہم سے کہا کہ وہ ایک ایسی سلطنت ورثے میں چھوڑ کر جائیں گے جو باقی رہے گی تو اپنے قدیم مضبوط اداروں کی وجہ سے رہے گی اور وہ ٹھوس ادارے قائم رہے تو حکومت خود بخود چلتی رہے گی۔ اس وقت ہم چھوٹے تھے۔ نوعمر تھے نادان تھے۔ ہمیں ان کی بات سے تکلیف پہنچی اور ہم یہ سمجھے کہ انہیں ہماری ذات اور ہماری سوجھ بوجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ ہم یہ سمجھے کہ غالبًا وہ یہ شبہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ ہم میں حکمران بننے کی قیادت نہیں ہے۔ پھر وہ تخت سے دستبردار ہوئے اور ہماری تاجپوشی ہوئی۔ تب ہمیں محسوس ہوا کہ کسی آئین بادشاہیت کا تاج وتخت میراث میں ملنے سے اقتدار وقوت ورثے میں نہیں مل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں چندسری (عددیہ) حکومت کے خلاف جمہوری اداروں کا قیام انتہائی ضروری تھا۔ ہم پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے قوتوں کو لامرکز بنانے کا عمل انتہائی تیز رفتاری اور عجلت سے کیا۔ اس عظیم کام کے لئے ہم نے صرف نشاۃ پارٹی پر اعتماد کیا۔ یہ ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے کہ ہم اس سلسلے میں کیوں ناکام رہے۔ آئینی بادشاہت کے دائرے میں رہتے ہوئے قومی زندگی کی ہر سطح پر بیک وقت تین چیزوں کا ہونا ضروری تھا "شرکت" "لامرکزیت اور جمہوریت" اور انکا اظہار قومی، صوبائی اور بلدیاتی انتخابات کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا۔ ایران ہمیشہ سے ایک مخلوط ملک چلا آرہا ہے یعنی یہاں مختلف نسلیں اور قومیں آباد ہیں جو مختلف زبانیں بولتی ہیں جن کی رسم درواج مختلف ہیں، جن کے مذہب بھی مختلف ہیں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ پس یہاں ایک ایسے حکمران کی ضرورت ہے جو اوپر سے اتحاد قائم کر سکے اور یوں ایک شاہی جمہوریت وجود میں آئے۔

لفظ شاہی اور لفظ جمہوریت اگر چہ ایک دوسرے کے ضد ہیں، اور ان کی پیوندکاری عجیب وغریب محسوس ہوتی ہے۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۵۰ء کے آئین کی رو سے بادشاہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری حکومت سے حاصل کرے۔ وہ محض آئینی حکمران ہوتا ہے یعنی وہ حکمران تو ہوتا ہے مگر حکومت نہیں کرتا۔ مختلف نسلوں اور قومیتوں کو ایک پرچم تلے متحد کرنے کا نام شاہی جمہوریت تھا۔ کیا اس اتحاد پیدا کرنے والی قوت کو جان بوجھ کر پارہ پارہ نہیں کیا گیا؟

کیا کھویا کیا پایا؟

انقلاب سفید کے کارناموں کو مختصر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایران کو ازمنہ وسطٰی کے اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی حالات سے نجات ملی اور ایران صف اول کی اقوال میں شمار ہونے لگا لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ موجودہ انقلاب خانہ جنگی، انتشار اور طوائف لملوکی ایران کو پھر بہت پیچھے لے جائیں گے اور ترقی کی جس راہ پر یہ گامزن ہو گیا تھا۔ وہ راہ اس سے چھن گئی ہے۔ ہماری ترقی کا اندازہ اعدادوشمار سے ہو سکتا ہے اور یہ ہمارے نہیں، اقوام متحدہ کے مرتب کردہ اعدادوشمار ہیں، انقلاب سفید کے بعد سے ایران میں معاشی ترقی کی سالانہ شرح ۱۳ فیصد رہی ہے۔ ان پچیس برس میں فی کس سالانہ آمدنی کی اوسط ۲۰ ڈالر بڑھ کر ۱۹۶۸ میں ۲۲۰۰ ڈالر تک پہنچ گئی۔ ان پچیس برسوں میں جدیدیت کے تمام عوام وعناصر نے اپنے اپنے شعبے میں انتہائی تیزی سے غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ کالج کھلے، سکول کھلے، پیشہ ورانہ ادارے وجود میں آئے۔ ہسپتال قائم ہوئے سڑکیں بنیں۔ ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ بند باندھے گئے پاور اسٹیشن قائم ہوئے۔ گیس کی پائپ لائن بچھائی گئی۔ کارخانے قائم ہوئے، صنعتی، ثقافتی اور کھیلوں کے بڑے بڑے کمپلیکس قائم ہوئے۔ انجمن ہائے امداد باہمی کی تشکیل ہوئی۔ نئے قصبے تعمیر ہوئے۔ تازہ بستیاں آباد ہوئی۔ اب ہمیں اندازہ ہے کہ یہ ساری ترقیاں کس قدر زوال پذیر ہو گئی ہوں گی۔ ہمارے عہد حکومت کے آغاز میں کل چار لاکھ طلباء سکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۷۸ء میں ان کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ایران میں ایک بھی یونیورسٹی موجود نہ تھی۔ ۱۹۷۸ء میں اٹھارہ یونیورسٹیاں تھیں اور اعلی تعلیم کے نئے ۱۳۷ کالج تھے۔ ہمارے والد کے عہد کے آغاز میں ۹۹ فی صد آبادی ناخواندہ تھی۔ ہمارے اپنے عہد کے آغاز میں ناخواندگان کی اوسط ۸۰ فیصد، لیکن ۱۹۷۸ء میں وہ صرف ۲۵ فیصد تھے۔ یہ ایسے ٹھوس حقائق ہیں جن کی تردید نہیں ہو سکتی۔ صدیوں کے فاصلے کو جلد از جلد پاٹنے کے لئے ہم نے اصلاحات کا پروگرام شروع کیا تو ہمیں احساس تھا کہ جب تک قوم کے تمام وسائل و ذرائع کو بھرپور طریقے سے استعمال نہ کیا جائے گا، ہمیں کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک ایسی ہنگامی حالت تھی کہ اس کے راستے میں جو بھی رکاوٹ آتی اس کو سختی سے راہ سے ہٹانا ضروری تھا۔ رکاوٹیں کیا تھیں؟ رجعت پسند طاقتیں بڑے بڑے جاگیردار، کمیونسٹ، قدامت پسند اور بین الاقوامی سازشیں۔ جو ملک ترقی کے میدان میں تیزی سے دوڑنا چاہتا ہو، اسے رکاوٹوں سے تحفظ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر شورش پسندوں اور سازشوں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا جائے تو اصلاحات کے پروگرام پر عمل کرنا ممکن نہ ہوتا اور اگر اس پروگرام پر عمل نہ کیا جاتا تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا کہ

ہم نے نیوز ویک کو اپنے اس نظریہ سے بھی آگاہ کیا جو پہلے بھی عالمی اخبارات میں تشہیر پا چکا تھا۔ دولت کی از سرنو تقسیم کا سوال نہیں۔ اس سے مسائل حل نہ ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے ترقی پذیر ممالک کو دل کھول کر امداد دی جائے تا کہ وہ دولت کے نئے وسائل پیدا کر سکیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ نئے وسائل پیدا ہو، امریکہ، مغربی یورپ اور جاپان ایسے ممالک ہیں جن کو فراخ دلی سے امداد دینی چاہیے۔ ہم نے یہ بھی کہا اور بار بار کہا کہ بعض اشتراکی ممالک بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ان کے پاس بھی ہر قسم کی دولت موجود ہے انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی بھی ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کے علاوہ دوسرے خطوں میں بھی اپنی مصنوعات انہی قیمتوں پر برآمد کرتے ہیں۔ جن کی قیمتوں پر امریکہ برآمد کرتا ہے۔ اس لئے ہم یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اشتراکی ممالک کو توانائی کا مسئلہ اور دیگر عالمی مسائل حل کرنے میں مغرب اور جاپان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ لیکن مصیبت یہی ہے کہ یہاں سچ بولنا سب سے بڑی حماقت اور سچ کی طرفداری کرنا سب سے بڑی غلطی ہے

جادوگر کے شاگرد

۷۹۔۱۹۷۸ء میں ایران میں جو دلدوز واقعات رونما ہوئے، ان کے بارے میں ایران سے باہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ''ملاؤں'' کا انقلاب ہے یعنی شیعہ مولویوں کا لایا ہوا انقلاب جن کی تعداد لگ بھگ ۲۰ ہزار ہو گی۔ اس اطلاع میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ۱۹۴۵ء میں والد بزرگوار ایران کو ''جمہوریہ'' قرار دینا چاہتے تھے لیکن ان کو مولوی حضرات نے ایسا نہ کرنے دیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ دین کی حفاظت بادشاہیت کا کام ہے۔ جمہوریہ کا نہیں! والد صاحب کی دستبرداری کے بعد ہم نے حلف وفاداری اٹھایا اور بارہ اماموں کے شیعہ عقائد کے احیاء کا بیان حلفی دیا تو ملک کے تمام دینی طبقے نے اتفاق رائے سے ہمیں محافظ دین قرار دیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہم دوہرے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ یعنی ایک سچے مسلمان کے ساتھ ساتھ حکمران کے فرائض بھی۔ ہم نے کلام پاک کے بخشے ہوئے اصولوں یعنی توازن، اعتدال، انصاف اور رواداری کے اصولوں پر چلنے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ اگرچہ ہماری دینی تعلیم بہت کم تھی، پھر بھی ہم نے قرآن مجید کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کر کے معنی مفہوم سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہم نے زندگی کے اکثر موقعوں پر محسوس کیا ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہے اور کٹھن مرحلوں پر اس کا سایہ اپنے اوپر محسوس کیا ہے پچھلے ابواب میں ہم کہیں کہیں بیان کر آئے ہیں کہ بعض تعلیمی و عدالتی اختیارات کم ہونے سے بعض مولویوں کو بہت مایوسی ہوئی ہم نے جو اصلاحات برپا کیں، ان میں سے بالخصوص زرعی اصلاحات اور خواتین کے حقوق کی بحالی سے بعض رجعت پسندوں کو بہت تکلیف پہنچی ان کے مفادات پر جو زد پڑی تھی اس لئے ان کی تکلیف بجا تھی لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان مٹھی بھر چند آدمیوں کے سوا، ہزاروں مولوی حضرات نے ہماری اصلاحات کی نہ صرف تعریف کی بلکہ ہمارا ساتھ بھی دیا۔ ہم ترقی کی راہ پر استقامت سے گامزن رہے اور ہم نے مخالفتوں وغیرہ کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ ۱۹۷۸ء یہی صورت حل تھی۔ یعنی مجموعی طور پر مولویوں کی تائید و حمایت ہمیں حاصل تھی اس سال موسم بہار میں ہم سالانہ زیارت کے لئے مشہد شریف گئے تو وہاں سینکڑوں علمائے دین نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔ ہمیں اپنی حمایت اور وفاداری کا یقین دلایا۔ ہمارے خلاف الزام تراشی اور افترا پردازی کی مہم معزز اور قابل احترام علمائے دین نے نہیں چلائی وہ مہم جس نے ہر قسم کی اخلاقی سوز بے حیا اور اشتعال انگیز تخریب کاری کو جنم دیا اس کا آغاز بائیں بازو کے انتہا پسندوں اور نام نہاد آزادگان نے کیا تھا جن کو بیرونی ممالک سے اخلاقی اور مالی امداد مل رہی تھی۔ ان کا مقصد ایک ہی تھا کہ ہمیں تاج و تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا جائے۔ ۱۹۷۸ء کے آغاز میں بعض مولوی اچانک تخریب کے محاذ پر نمودار ہو گئے۔ پھر تو جوں جوں ملک میں بے امنی اور انتشار بڑھتا گیا۔ بے شمار آیت اللہ اور بے حساب مولوی ملا خدا جانے کہاں کہاں سے نکل کر حماقت و تخریب کی راہ پر چل نکلے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثریت نے اپنے آپ کو مجبور و بے بس پایا اور انہوں نے دہشت گردی کی فضا میں قدر عافیت اسی میں سمجھی کہ خاموشی اختیار کر لی۔ کمزوری بزدلوں اور جاہلوں کی ہدایات پیرس کے اس قصبے سے مل رہی تھیں۔ جہاں حضرت ''آیت اللہ'' تشریف فرما تھے۔ یہ ہدایات محض دھمکیاں تھیں جو ایک بزرگ آدمی کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ جو خود کو خدا کی برگزیدہ ہستی سمجھتا تھا۔ ہمیں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بیشتر مولوی آج لوگوں کو اس عذاب میں دیکھ کر پچھتا رہے ہیں کہ ایسا تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ لوگوں کے عذاب سے ہماری مراد وہ لوگ بھی ہیں جو خانہ جنگی کی حالت میں مارے گئے، وہ لوگ بھی جن کو بلاوجہ پھانسی دی گئی، وہ خاندان بھی جو بے گھر ہوئے، وہ لوگ بھی جن کو لوٹا مارا گیا، جن کو دہشت زدہ کیا گیا، اور وہ لاکھوں لوگ جو بے روزگار اور بے کار ہو کر بیٹھ رہے۔ ایک سال پہلے تک ایران وہ ملک تھا جس نے دس لاکھ غیر ملکیوں کو اپنے ہاں روزگار فراہم کر رکھا تھا، جو لوگ واقعی دین اسلام سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ ایران میں اسلامی اصولوں کی یہ بے حرمتی دیکھ کر شرم سے ان کے سر جھک گئے ہوں گے۔

حصہ نمبر 20

جہلم اور سیاست

۱۹۷۸ء میں جو دہشت گردی ہوئی۔ عالمی پریس کے لئے وہ تماشہ بن گئی۔ اس سے پہلے بھی ہمیں ہمارے وزیروں اور جنرلوں پر متعدد بار قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ لیکن ہر بار ہم معجزانہ طور پر بچ جاتے تھے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۶۴ء کو ایک نوجوان سپاہی شام آبادی نے ہم پر اس وقت قاتلانہ حملہ کیا جب ہم اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے کام میں مصروف تھے۔ گولی ہمیں چھو کر گزر گئی۔ اس خبطی نے دو مالیوں پر فائر کیا۔ دو محافظوں کو ہلاک کیا۔ انہوں نے جان دینے سے پہلے اسے بھی ختم کر دیا۔ تحقیقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ بائیں بازو کی سازش کا شناخسانہ تھا۔ اس سازش کے پیچھے جس شر پسند شخص کا ہاتھ تھا۔ اسے عدالت نے دس سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی۔ لیکن ہم نے یہ سزا رحمدلی سے معاف کر دی، اس خیال سے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے گا۔ لیکن وہ اپنی شر انگیزی سے باز نہ آیا۔ چنانچہ ۱۹۷۹ء میں اسے موت کی سزا ملی اور اسے پھانسی دی گئی۔ اس کے حامی جو زیادہ تر انجینئر تھے۔ انہوں نے مانچسٹر یونیورسٹی میں تعلیم پائی، ہم نے اس کے ساتھیوں کو معاف کر دیا۔

۷ مارچ ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم جنرل رزم آرا کو ایک مذہبی جنونی نے جامع مسجد میں قتل کر دیا تھا۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں وزیر اعظم علی منصور کو بے وردی سے قتل کیا گیا۔ قاتل وہابیات کا ایک طالبعلم محمد بخاری تھا۔ اس کی طرح بہت سے عہدہ داروں کو جن میں جنرل مولای اور جنرل طاہر بھی شامل تھے، قاتلوں کا نشانہ بنے ۱۹۷۲ء میں تین امریکی کرنلوں کو تہران کے بازار میں سر عام قتل کیا گیا۔ مقتولین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کی فہرست مرتب نہیں کی جا سکتی۔ ان میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی، مشہور بھی تھے اور گمنام بھی۔ ان سب کی جان دہشت گردی نے لی۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور اور کاریں صاف کرنے والا بے گناہ مزدور بہت یاد آتا ہے۔ جو دہشت پسندوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔

۱۹۷۶ء کے آخر میں ہماری حکمرانی کے خلاف جارحانہ تحریک کو بیرونی امداد بھی ملنے لگی۔ بین الاقوامی ریڈ کراس، بین الاقوامی انجمن وکلاء اور ایسی ہی دوسری عالمی تنظیموں نے ہم سے کہا کہ وہ ایران میں اپنے نمائندے بھیج کر اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے منظوری دے دی، لیکن ساتھ ہی ان سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ اپنے مشاہدات، معلومات اور تجاویز سے ہمیں بھی آگاہ کریں، ہم نے اپنے انقلاب سفید کے تحت ہونے والی اصلاحات سے ان کے نمائندوں کو پوری طرح باخبر رکھا۔ انہوں نے تحقیقات کیں۔ رپورٹ مرتب کی لیکن ان کے دوسرے نتائج کا ہمیں پتا نہ چل سکا۔ ۱۹۷۷ء میں ایک واقعہ رونما ہوا، اور وہ یہ کہ دہشت گردی یکا یک رک گئی۔ ہمیں فوراً احساس ہو گیا کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور یقیناً کوئی بڑا منصوبہ بن رہا ہے۔ منصوبہ سازوں کو یقین ہو گیا تھا کہ دہشت گردی اور اکا دکا قتل و غارت سے ان کے مفید مطلب نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اسلئے وہ یقیناً کوئی اور پتہ پھینکیں گے اور وہ یہی ہو سکتا تھا کہ سیاسی سطح پر عوام کو احتجاج پر اُکسایا جائے۔ گویا یہ خاموشی دراصل احتجاج کی ریہرسل تھی۔ اس تحریک کے سربرآوردہ رہنما بہت امیر کبیر لوگ تھے۔ جس حکومت کے خلاف وہ واویلا کر رہے تھے، اس حکومت نے انہیں زیادہ سے زیادہ کاروبار کرنے اور زیادہ سے زیادہ دولتمند بننے سے نہیں روکا تھا۔ ان رہنماؤں کے بہت گہرے روابط اور سلسلے مغربی ممالک سے قائم چلے آرہے تھے۔ اب جو انہوں نے موقع دیکھا تو یکے بعد دیگرے بڑے عالمانہ فاضلانہ بیانات جاری کرنے لگے اور ''پارلیمانی جمہوریت'' کے مطالبے ہونے لگے۔

ہم خود بھی جمہوریت پسند تھے اور ملک کو سچی جمہوریت دینے کے آرزومند تھے جس کے تحت ایرانی جمہوریہ پھلے پھولے۔ شروع سے آخر تک ہمارا رویہ، ہمارا عمل ہماری آرزوئیں، ہماری خواہشیں ایران کی آزادی اور خوشحالی کے لئے وقف رہی ہیں۔ لیکن ہم ایسی کچی پکی، ہم پختہ، مصنوعی، برائے نام جمہوریت کے قائل نہ تھے جیسی کہ دوسرے ملکوں میں نظر آتی ہے اور جو سیاسی پارٹیوں کی بھرمار تلے سسک سسک کر چکنا چور ہو جاتی ہے۔ جمہوریت کے ان علمبرداروں کی مخالفانہ تحریک احتجاج مسلسل پروپیگنڈہ دراصل اپنی حریت پسندی ترقی پسندی کے اصلاحی پروگرام کے خلاف تھا جس کی رفتار تیز سے تیز ہو رہی تھی۔ ہمیں فوراً ہی احساس ہو گیا کہ ہمیں ان لوگوں نے چیلنج کیا ہے۔ جوں جوں ہم آزادی اور ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ اسی حساب سے ملک کی اندرونی صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ہم اصلاح احوال کیلئے جو بھی قدم اُٹھاتے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ہماری یا ہماری حکومت کی کمزوری ہے۔ جو لوگ جلد از جلد برسر اقتدار آنے کے خواب دیکھ رہا تھے ان کے نقطہ نظر سے یہ سب کچھ بڑی سست رفتاری سے ہو رہا تھا۔ اس موقعہ پر بعض مولوی پردے کے پیچھے سے برآمد ہوئے اور تخریب کاروں کی صف اول میں شامل ہو کر رہنما بن کر ابھرے، اور یوں گویا سرخ و سیاہ کے معاہدے پر اب مہر تصدیق بھی ثبت ہو گئی۔

حصہ نمبر 21

کچھ ساواک کے بارے میں !

دہشت گردی کا ظہور تو ہوا تو ''ساواک'' بین الاقوامی پریس کا محبوب موضوع بن گئی۔ آخر یہ بھی تو سوچنے کی بات تھی کہ جتنی زیادہ غنڈہ گردی ہوگی۔ جتنا زیادہ بے گناہ پر امن شہریوں کا خون بہایا جائے گا۔ پولیس بھی تو اسی قوت سے حرکت میں آئے گی۔ بدترین قسم کے جرائم ساواک سے منصوبے کئے گئے۔ یہاں تک کہا گیا کہ اس تنظیم میں لاکھوں افراد ملازم ہیں۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ کون سا جادو تھا کہ جونہی ہمارا تخت ہلنے لگا۔ یہ لاکھوں وفادار ملازم یک بیک ہمارے خلاف ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۸۷ء کے آغاز میں ساواک میں صرف ۳۲۰۰ ملازمین تھے۔ سال کے آخر تک نفری بڑھائی گئی تو زیادہ سے زیادہ تعداد چار ہزار ہو گئی ہوگی۔ ساوات قومی سلامتی اور اطلاعات کو تنظیم تھی۔ اس قسم کی تنظیمیں دنیا کے ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ ہر ملک کو اپنی داخلی سلامتی اور بیرونی جارحیت سے دفاع کا حق پہنچاتا ہے۔ ایسی تنظیمیں ان ملکوں میں بھی ہیں۔ جہاں آمریت ہے اور وہاں بھی جہاں جمہوریت ہے کہ جی بی، سی آئی اے، ایف بی آئی یہ سب ایسی ہی تنظیمیں ہیں۔

ڈاکٹر مصدق والے تباہ کن واقعات کے بعد کمیونٹوں کی تخریب کاری کو روکنے کے لئے ''ساواک'' قائم کی گئی تھی۔ مغربی ممالک نے کمیونسٹوں کو روکنے کے لئے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ بھی دنیا سے مخفی نہیں لیکن ان ملکوں میں اور ایران میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ وہ سویت یونین سے بہت دور ہیں اور ہماری سرحدیں روس سے ملتی ہیں۔ اگرچہ آج خوش قسمتی ہے روس سے ہمارے تعلقات خوشگوار ہیں۔ ایک دوسرے کے مفاد پر مبنی اقتصادی تعاون بھی ہے لیکن جنگ کے فوراً بعد ہمیں بے اندازہ مشکلات سے گزرنا پڑا تھا۔ روسی افواج جنہوں نے ایران پر قبضہ کیا تھا۔ وہ اپریل ۱۹۴۶ میں یہاں سے گئی تھیں۔ ڈاکٹر مصدق کے زمانہ حکومت میں تو وہ پارٹی یہ سمجھنے لگی تھی بس اب ان کا راج آنا ہی چاہتا ہے۔ یہ پارٹی صرف ہماری حکومت ہی کا تختہ الٹنے کا ارادہ نہ رکھتی تھی بلکہ ملک کی علاتائی سلامتی کو بھی تباہ کرنے کے درپے تھی۔ اس لئے ہم نے اس کو کالعدم قرار دیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کو اندرونی تخریب کاری اور بیرونی سازشوں سے جو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ ساواک اس کو دور کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی ساواک کا سربراہ جنرل بختیار کو مقرر کیا گیا۔ جنرل نے سی آئی اے سے مشورے اور رہنمائی حاصل کی۔ چنانچہ ساواک کے بڑے بڑے افسروں کو تربیت دینے کے لئے سی آئی اے کے صدر دفتر لینگلے بھیجا گیا۔ اس افسروں نے دوسرے ملکوں کا بھی دورہ کر کے معلوم کیا کہ وہاں تخریب کاروں کو کچلنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ جنرل بختیار میں اس عہدے پر ۱۹۲۶ تک فائز رہے، جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ حریص شخص ہے اور تنظیم کو اپنے ذاتی اغراض کیلئے استعمال کر رہا ہے تو ہم نے اسے رخصت دی، جلاوطن کیا گیا۔ بیروت میں جا کر وہ سازشوں سے باز نہ آیا لیکن چند سال بعد عراق میں مقبول ہوا۔

دوسرے ملکوں کی طرح ایران میں بھی غدار تھے، جاسوس تھے، سازشی تھے، پیشہ ور احتجاجی تھے، سبوتاژ کرنے والے تھے جن کے بارے میں ہماری حکومت پولیس، ہماری فوج کو آگاہ رہنا چاہیے تھا۔ اطلاع دینے کا فریضہ ساواک کے سپرد تھے۔ اطلاع دہندہ اور جاسوس ادارے کی حیثیت میں ساواک سول مجسٹریٹوں کی بھی اعانت کرتی تھی۔ لیکن بین الاقوامی وکلاء کی انجمن نے سفارش پر یہ فریضہ ساواک سے لے کر عام پولیس کو منتقل کر دیا گیا۔ ساواک کے افسران با اعتماد سپاہی تھے جو عام طور پر پولیس اور فوج سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ ان میں زیادہ تر یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ اس کے باوجود ساواک کے ملازمین کی زیادہ تعداد سول حضرات پر مشتمل تھی۔ یہ الزام بالکل غلط ہے کہ سواک عدالتی کاموں میں داخل در معقولات کرتی تھی۔ ساواک کی سرگرمیوں کو ان لوگوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ جو ملک میں امن و امان اور اس کی ترقی کے خلاف تھے انہوں نے یہ اطلاعات شائع کرائی ہیں کہ ملک میں سیاسی قیدیوں کی تعداد جن پر تشدد کیا گیا۔ پچیس ہزار سے ایک لاکھ تک تھی۔ یہ محض الزام تراشی ہے۔ اس کا ثبوت حزب اختلاف کے شائع کردہ ایک اخبار سے ہوتا ہے جو ایران میں گمنام پریس میں طبع ہوا۔ اس میں یہ دعوی کیا گیا کہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ کے درمیانی عرصے میں یعنی نو سال میں سیاسی وجوہ سے گرفتار شدگان کی تعداد ۳۱۶۴ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں پولیس یا اطلاعات کی ذمہ داری سربراہ مملکت پر عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ یا تو وزیر اعظم یا وزیر دفاع یا وزیر داخلہ پر عائد ہوتی ہے۔ ایران میں

حصہ نمبر 22

وزیر اعظم شاہ پور بختیار

اس پورے عرصے کے دوران میں ہم دعا کرتے رہے کہ کاش ہمارے مخالفین نیک نیتی سے کام لیں۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں۔ شہری آزادیاں اور حقوق، وہ مل جائیں گے وہ بدعنوانیوں سے اظہار نفرت کر رہے ہیں؟ ان سے زیادہ ہم خود بدعنوانیوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ بہر صورت ہم نے عزم کر رکھا تھا کہ طاقت کا سہارا نہیں لیں گے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے ہمیں امید تھی کہ جس بحران سے ہم گزر رہیں وہ بھائی چارے اور مصالحت کی فضائیں آئینی طور حل ہو جائے گا اور کوئی بہتری کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ ہمارا خیال تھا کہ ایک ایسی سول حکومت جس میں حزب اختلاف بھی شامل ہو۔ مظاہروں پر قابو پالے گی اور ملک پھر امن و امان اور کام کاج کی راہ پر چل پڑے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صادقی سے رجوع کیا۔ وہ نیشنل فرنٹ کے رکن تھے اور بڑے مخلص اور محبت وطن وہ بغیر کسی شرط مخلوط حکومت بنانے پر رضامند ہو گئے۔ لیکن غور و فکر کے لئے ایک ہفتے کی مہلت چاہی۔ لیکن ان پر ان کی پارٹی کا دباؤ پڑا تو وہ مخلوط حکومت بنانے سے تو منحرف ہو گئے۔ البتہ ہم سے مطالبہ کیا کہ ہم ایران ہی میں رہیں اور ایک ریجنسی کونسل بنا دیں۔ یہ ہمارے لئے قابل قبول نہ تھا، کیونکہ اس کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم حکمران بادشاہ کے فرائض انجام دینے کے نااہل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف واحد سیاست دان تھے، جنہوں نے ازراہ خلوص ہم سے کہا تھا کہ کسی قیمت پر بھی ایران نہ چھوڑیں۔

مسٹر سنجابی اور مسٹر بازرگان نے تہران واپس آ کر حکومت کے خلاف ایسی شدید اور زبردست مہم چلائی تھی اور ایسے غیر آئینی بیانات دیئے تھے کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مسٹر سنجابی نے قید خانے سے ہم ملاقات کا پیغام بھیجا۔ پیغام رسانی کے لئے انہوں نے خود ساواک کے سربراہ کو استعمال کیا یعنی اس جنرل مقدم کو جو آموزگار کے زمانہ حکومت میں ایک مذہبی رہنما کا پیغام ہمارے نام لائے تھے اور جن کو انقلاب کے فوراً بعد شاید انہی خدمات کے عوض گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ ہم پہلے ہی ہر قیمت پر مصالحت کے لئے تیار تھے۔ اس لئے ہم نے مسٹر سنجابی کی رہائی کا حکم دیا اور انہیں باقاعدہ ملاقات کے لئے مدعو کیا۔ بوقت ملاقات انہوں نے ہمارے ہاتھ چومے ہماری ذات سے وفاداری کا پرجوش اظہار کیا اور کہا کہ وہ حکومت بنانے کیلئے تیار ہیں مگر ایک شرط پر کہ ہم تعطیلات کے بہانے ایران سے چلے جائیں۔ انہوں نے نہ تو یہ کہا کہ ہماری روانگی سے پہلے کسی نوعیت کی ریجنسی کونسل بنائی جائے، جس کی تشکیل آئینی لحاظ سے ضروری تھی۔ نہ یہ کہ پارلیمنٹ سے اس اقدام کی منظوری لے لینی چاہیے۔ ہم نے یہ غیر آئینی راستہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سلسلہ مذاکرات جاری رہنا چاہیے۔ تاوقتیکہ کوئی نتیجہ خیز حل برآمد نہ ہو جائے۔ لیکن صورتحال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

کیا ان سیاست دانوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ملک تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا ہے؟ کیا انہیں امر کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ اب مسئلہ مراعات، اجارہ داری یا کسی سیاسی پارٹی کی برتری کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ اب نئی ملک کی زندگی اور موت کا بن گیا تھا۔ بازاروں اور گلیوں میں یونیورسٹیوں میں جو مظاہرے ہو رہے تھے۔ وہ یقیناً بہت زیادہ تشویشناک اور پریشان کن تھے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ تشویش اور پریشانی اس بات کی تھی کہ اقتصادی بے چینی اور بدامنی ملک کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی تھی ملک دیوالیہ ہو رہا تھا۔ ہڑتال پہ ہڑتال ہو رہی تھی۔ کوئی دن نہ جاتا جب ہڑتال نہ ہوتی۔ تیل کی پیداوار جو اٹھاون بیرول تک پہنچ گئی تھی۔ وہ گھٹ کر ۲۵ دسمبر کو فقط سترہ لاکھ بیرل ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اقتصادی لحاظ سے ملک تباہ حال ہو رہا تھا۔ سویت روس کو گیس کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا ایسی بری صورت حال کو مزید ایک دن کے لئے بھی برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ وقت تھا کہ نیشنل فرنٹ کے ایک سرکردہ لیڈر ڈاکٹر شاہ پور بختار نے۔ ساواک کے سربراہ ہی کی وساطت سے ہم نے رابطہ قائم کیا اور ملاقات چاہی۔ ان سے ہمارا پہلے بھی اگست سے مسٹر آموزگار کے ذریعے رابطہ رہ چکا تھا۔ آموزگار اس وقت وزیر اعظم تو نہ رہے تھے لیکن بڑی حکمت اور دانائی سے ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے۔ ہم اس وقت ہی سے مخلوط حکومت بنانے کی خواہش رکھتے تھے، لیکن حزب اختلاف کے بعض رہنماؤں کی شدت پسندی کے باعث یہ خواہش شرمندہ تکمیل نہ ہو رہی تھی۔ نیشنل فرنٹ کے مسٹر سنجابی تو اشتعال انگیز تقریروں پر اتر آئے تھے، لیکن ڈاکٹر بختیار کا طرز عمل بڑا محتاط اور مدبرانہ تھا۔

چنانچہ ایک شب وہ جنرل مقدم کی ہمراہی میں ہم سے ملاقات کے لئے محل پر تشریف لے آئے۔ بڑی دیر تک مسائل حاصرہ پر گفتگو ہوتی رہی، ڈاکٹر بختیار نے ایک طرف تو ہمیں اپنی غیر معمولی وفاداری کا یقین دلایا اور دوسری طرف یہ بھی دلائل سے ثابت کیا کہ وہ واحد شخص ہیں جو موجودہ بحران میں حکومت بنا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بختیار نے تجویز کیا کہ ''تعطیلات'' پر ایران سے چلے جایئے پہلے، آئین کا تقاضا پورا کرنے کے لئے ریجنسی کونسل بنائی جائے اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے اس اقدام کی منظوری لی جائے۔ ہمارے لئے یہ بات قابل قبول تھی۔

حصہ نمبر 23

جلاوطنی کا آغاز

اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے شاہ پور بختیار کی تقرری کی منظوری ہوتے ہی ہم چند ہفتوں کی تعطیل پر ملک سے باہر چلے جائیں گے۔ وہ آخری ایام ہمارے لئے انتہائی دلدوز اور قیامت خیز ثابت ہوئے وطن عزیز کی خاک پاک کے جدا ہونے کے تصور سے ہی دل میں درد اُٹھتا تھا۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ دن کو چین نہ تھا۔ روانگی کا وقت تیزی سے آ رہا تھا اور کام بہت کرنے تھے۔ خدا جانے پھر آنا ہو یا نہ ہو۔ ایک ایک لمحہ اور ایک ایک ساعت ہم اپنے ملک کے مستقبل کی فکر میں گھلے رہتے تھے۔

۱۶ جنوری ۱۹۷۹ کی صبح کو جب ملکہ اور ہم ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت کے پر سوز جذبات کی ترجمانی ہم نہیں کر سکتے۔ خدا جانے ملک کا کیا بنے گا کیا ہو گا؟ ہر دفعہ ہم اپنے آپ کو سمجھاتے تھے کہ انشاء اللہ اچھا ہی ہو گا۔ ان کو دشمنی تو ہم سے ہے، ہم نہ رہیں گے تو دشمنی بھی نہ رہے گی۔ نفرت وحقارت کی نگاہ محبت ورواداری سے بدل جائے گی۔ غیظ وغضب ٹھنڈا پڑ جائے گا اور قاتل جو گلیوں میں منڈلاتے پھر رہے ہیں اپنا اسلحہ ایک طرف رکھ دیں گے۔ مہر آباد کے ہوائی اڈے پر اس موسم کی عین مطابق ٹھنڈی برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ ہڑتال کی وجہ سے ہوائی جہاز قطاروں میں خاموش کھڑے تھے۔ جس بوئنگ کو ہمیں لے کر پرواز کرنا تھا اس کے قریب مملکت ایران کے زعماء جو ہمیں رخصت کرنے آئے تھے، خاموش اداس کھڑے تھے۔ ان میں شاہ پور بختیار تھے پارلیمنٹ کے دو ایوانوں کے صدر تھے، وزراء تھے۔ جنرل تھے، ہم نے ان سے کہا، جہاں تک ممکن ہو صبر وتحمل سے کام لیں، خدا شاہد ہے کہ جہاں تک ہمارے اختیار میں ممکن ہے ہم نے ان لوگوں کو بچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جنہوں نے ملک قوم کی یا ہماری خدمت بجالائی تھی۔ جب ہم ملک سے باہر دورے وغیرہ پر جایا کرتے تھے تو وقت روانگی ہوائی اڈے پر امام جامی آیات ربانی پڑھ کر ہماری سلامتی کی دعا مانگا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ بھی موجود نہ تھے۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ بھی جان بوجھ کر غائب ہو گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ واقعی بیمار تھے اور چند روز کے بعد فوت ہو گئے تھے۔ لیکن ہمارے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ ضرور موجود تھا جو ہم اپنے سے ایک لمحہ بھی جدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہمیں الوداع کہنے والوں نے جن جذبات واحساسات کے ساتھ اور جس المناک انداز میں ہمیں رخصت کیا۔ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہوائی اڈے پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے میں صرف سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، وہ ملک جس پر ہم ۳۷ برس تک حق حکمرانی ادا کیا اور جس کی خاطر ہم نے خون جگر پیا۔ اس کی آخری یاد بس اتنی ہے کہ الوداع کہنے والوں کے چہروں پر قیامت کا دور وکرب تھا اور ان کو آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

جلاوطنی کا ہمارا پہلا قیام اسوان تھا۔ انوار السادات اور ان کی بیگم ہم سے ملنے آئے ہمیں کئی تعجب نہ ہوا۔ ہم ان کی شرافت اور اخلاق سے پہلے ہی واقف تھے۔ ہم وہاں چند روز رہے ان دونوں نے ہماری میزبانی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اپنی سادگی، مہربانی اور خلوص ومحبت سے انہوں نے ملکہ اور ہمیں بہت متاثر کیا۔ اور ہمارے آرام کا پورا پورا خیال رکھا۔ صدر سادات چاہتے تھے کہ ہم مستقل مصر میں قیام کریں لیکن ہم نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ جہاں تک چلی، چلے، ابھی کچھ عرصہ یہاں وہاں گردش ایام کے ساتھ گھومتے ہیں۔ اس وقت ہم امریکہ جانے کی سوچ رہے تھے جہاں ہمارے بچے تعلیم پا رہے تھے لیکن ہر طرف سے ہمیں خبردار کیا جا رہا تھا۔ دیکھو امریکہ نہ جانا، ہرگز نہ جانا۔ بہرصورت مسافرت میں مراکش میں پڑاؤ ڈالا۔ شاہ حسن ثانی نے بالکل سگے بھائیوں کی طرح ہمیں سینے سے لگایا اور محل میں شاہی مہمانوں کی طرح رکھا۔ جب ہم نے مئی کے آغاز میں بہاما جانے کا فیصلہ کیا تو شاہ حسن نے ہمیں خصوصی طیارہ دیا لیکن جلاوطنی میں بھی ہمارے دل میں ایران کی گلیاں چھبتی رہتی تھیں۔ وہاں سے روزانہ، پھانسیوں کی خبریں آ رہی تھیں اور یہ سلسلہ کسی طرح رکنے کا نام نہ لیتا تھا، بلکہ بڑھتا چلا رہا تھا۔ بہاما میں ساحل سمندر پر ایک ولا میں ہمارا قیام تھا اور ہر کوئی ہمارے پاس بلا روک ٹوک آ سکتا تھا۔ اس لئے پولیس کی بھاری جمعیت ہماری حفاظت پر تعینات کر دی گئی تھی۔ ہمیں اس سے بہت ذہنی کوفت ہوئی تھی۔ ہم ایک طرح کے قید خانے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہرصورت ان تکلیف دہ ایام میں سیاح ہمارے لئے ایک خوشگوار کیفیت پیش کرتے تھے۔ وہ ملکوں ملکوں سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ زیادہ تر جرمن اور فرانسیسی تھے۔ ہمیں دیکھ کر دور ہی سے اس انداز سے ہاتھ ہلاتے تھے۔ جیسے ہم سے اظہار ہمدردی کر رہے ہوں۔ یکایک فیصلہ ہوا کہ بہاما میں ہمارا قیام مناسب نہیں اور ہمیں اب یہاں سے جلد از جلد چلے جانا چاہیے۔ لیکن کہاں یہ معلوم نہ تھا۔ ہم کسی ایسے ملک کا انتظار کر رہے تھے، جو مہربانی سے ہمیں آخری بار مہمان بننے کا شرف عطا کر سکے۔ بالآخر یہ ملک میکسیکو نکلا۔ اس پر

۲۸ فروری کو بازرگان نے پھر دھمکی دی کہ اگر کمیٹیوں کے اختیارات کی صراحت اور تجدید نہ کی گئی وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ ۸ مارچ کو انہیں مکمل یقین دلایا گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ گرفتاریاں فائرنگ اور تشدد کے واقعات اور سرسری سماعت کے فوراً بعد پھانسی کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ تقریباً تمام ڈویژنوں کے کمانڈنگ افسر کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ کیونکہ انہوں نے ہماری حکومت میں اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ ایک ضعیف نسیٹر کو جن کی عمر سو سال سے زائد تھی اس جرم وفا میں پھانسی چڑھا دیا گیا۔ ۷۰ برس سے زیادہ عمر کے کتنے ہی بوڑھوں کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا مقتولین کی فہرست کی گنتی بھی نہیں ہوسکتی۔ گھر کے گھر اور خاندان کے خاندان خون میں لت پت کر دیئے گئے ہیں۔ جن مقتولین کے نام اشاعت پذیر ہو گئے ہیں ان میں یہ لوگ شامل تھے۔ وزراء میئر، میونسپل کونسلر، سرکاری عہدہ دار سیکرٹری خواص سفارتی نمائندے اور سفارت کار۔ سیاست دان صوبائی گورنر، تینوں افواج کے بے شمار جنرل، بڑے بڑے افسران چھوٹے افسران، عام فوجی سپاہی پولیس والے۔ اخبار نویس صحافی ادیب ناشر براڈ کاسٹرز، مجسٹریٹ حضرات، وکلاء صاحبان علمائے دین، ڈاکٹر، پروفیسر، تجارت پیشہ ور لوگ ان سب کو اللہ کے نام پر سرسری سماعت کے بعد گولی سے اُڑا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے ہزاروں شہریوں نے شاہ پور بختیار کی ہدایت پر عمل کیا جو اس وقت بھی حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے اور روپوش ہو گئے، خود شاہ بختیار بھی روپوش ہو گئے اسی جرم ووفا کی پاداش میں انہیں بھی پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ مغربی ممالک کے بڑے بڑے اخبارات میں شاہ پور بختیار کے بیٹے کا ایک کھلا خط خمینی صاحب کے نام چھپا تھا۔ اس خط کی آخری سطور ہی قابل ملاحظہ ہیں خمینی صاحب آپ کو صرف سروں کی ضرورت ہے اور جس وقت میں سطور لکھ رہا ہوں، کتنے ہی سروں کو آپ کے مقدس احکام کے تن سے جدا کیا جا چکا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کا قصور کیا ہے..... بلاشبہ آپ میں اتنی طاقت ہے کہ آپ کے پٹھو آپ کے ایک ادنیٰ اشارے پر میرے والد کے دلا پر حملہ کر سکتے، لوٹ سکتے ہیں انہیں گولی سے اُڑا سکتے ہیں..... کیا شاہ پور بختیار مجرم ہے؟ پھر آپ کون ہیں کہ محض اپنی خوشنودی طبع کے باعث ہزاروں نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا..... پھر بھی آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ تاریخ آپ کو عظمت کے رتبے پر فائز کرے گی۔ آپ ایران میں احیائے جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ خط مارچ ۱۹۷۹ میں لکھا گیا۔ اس وقت تک نام نہاد، اسلامی انقلاب، کے مجاہدین پوری طرح منظم نہ ہوئے تھے، چنانچہ بے شمار ''مشکوک افراد'' خاص طور پر قصبات اور دیہات کے لوگ، اسلامی عدالتوں، دستوں کی دست برد سے بچ نکلنے میں کامیاب کر دی گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ توہین آمیز اور غیر انسانی سلوک کے باعث ذہنی طور پر پہلے ہی ہلاک ہو چکے تھے۔ جب ہم نے ہویدا کی موت کی خبر سنی تو ہمیں بہت قلق ہوا۔ ہم سارا دن اپنا کمرہ بند کر کے خلوت میں مرحوم کے لئے درد محسوس کرتے رہے اور ان کی رحمت وبخشش کے لئے دعا مانگتے رہے۔ ہویدا ایک ایسا چشم دید گواہ تھا جو کسی روز مدعی بن کر سامنے کھڑا ہو سکتا تھا، اس لئے اسے مار دیا گیا۔ یہ محض قتل ہے، سادہ قتل، یہ اتنے بڑے آدمی کا قتل تھا کہ اس کو خفیہ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس پر پوری دنیا کے اخبارات نے صدائے احتجاج بلند کیا۔ امریکا، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، فرانس، اور دیگر ممالک کو حکومتوں نے سرکاری طور پر تعزیب وافسوس اور غم وغصے کا اظہار کیا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائیم صرف اتنا کہہ سکے، نئی ایرانی حکومت نے رحم کی اپیلوں کی کوئی پروانہ کی۔

جلاد اپنا کام دکھاتے رہے

۱۱ اپریل کی رات کو دو بجے ایک ''ٹریبونل'' نے سرسری سماعت کے بعد گیارہ افسروں کو موت کی سزا سنائی، آدھ گھنٹے بعد انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ ان میں سے پہلا مجرم، جنرل حسن تھا جس کا واحد جرم یہ تھا کہ وہ پندرہ سال پہلے ساواک کا سربراہ ہوتا تھا، وہ مثالی سیرت وکردار کا ایک با اصول شریف انسان تھا۔ اس نے متعدد موقعوں پر عدالتوں سے سزا یافتہ حریفوں اور بالخصوص بے شمار مولویوں کی سزا معاف کرانے کے لئے ہم سے اپیلیں کی تھیں۔ ان کے ساتھ چار جنرلوں کو بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک تو جنرل مقدم جنہوں نے ہمارے اور کریم سنجانی کے درمیان مذاکرات کرائے تھے۔ جنرل جت جو کھیلوں کے ڈائریکٹر تھے۔ جنرل علی نجد جو شاہی گارڈ کے سابق سربراہ تھے، جنرل تاغی مجدی جن کو ملازمت سے ریٹائرڈ ہوئے بھی پندرہ سال ہو چکے تھے۔ سابق وزیروں میں سے منصور بہمی اور عباس علی خلعت باری موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ ایوان زریں کے صدر عبداللہ ریاضی بھی تختہ مشق بنے۔ سوا یہ ضعیف العمر پیٹر علامہ واحدی بھی گئے۔ نائب صدر علی بابایات کو بھی اس طرح بیدردی سے ہلاک کیا گیا۔ تہران کے میئر غلامی رضا بھی گولیوں سے چھلنی ہوئے۔ اس قتل وقتال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وکلاء کے بین الاقوامی کمیشن کا ایک اجلاس جنیوا میں منعقد ہوا۔ کمیشن نے یہ قرارداد منظور کی۔

اسلامی ٹریبونل جو ایران میں لوگوں کو موت کی سزائیں دے رہے ہیں۔ وہ کھلم کھلا شہری وسیاسی حقوق کے بارے

سرگرمی سے حصہ لیا۔

ان ممالک نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ تیل کی قیمت منصفانہ اور جائز ہونی چاہیے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک کے درمیان دولت کے ازسرنو تقسیم کی خاطر قربانیاں دینے سے انکار کر دیا۔ تیل استعمال کرنے والے ممالک شمال و جنوب کے اتحاد کے سخت دشمن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ تو لیبیا کو نشانہ بنایا نہ کسی اور تیل پیدا کرنے والے ملک کو۔ ۱۹۷۶ء سے امریکہ کی تیل کی دینا کی دو اہم شخصیتیں برابر اعلان کر رہی ہیں کہ دو سال کے اندر اندر شاہ کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھ ساتھ تیل پیدا کرنے والے ممالک کی معیشت بھی تو بیٹھ جائے گی۔ آج ایران میں کیا رہ گیا ہے۔ ہم نے جو اتنے بڑے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ ان کا کیا حشر ہوا۔ کچھ باتیں یہاں دہرانے میں مضائقہ نہیں۔ ہم نے فرانس کو چھ ایٹمی ری ایکٹروں میں سے دو کا آرڈر دے دیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ایٹمی اسٹیشنوں سے ملک کو ایک عظیم صنعتی ملک بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان میں سے ہر دی ایکٹر پر پندرہ ارب فرانگ خرچ ہونے تھے۔ علاوہ ازیں ہم نے اصفہان میں ایک ایٹمی ریسرچ سینٹر قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ دس ارب فرانگ کے خرچے سے تہران میں زمین دوز ریلوے لائن بچھانے کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ تہران سے بندر شاہ پور تک ریلوے لائن کی دوہری پٹڑی اور بجلی سے چلنے والے انجن اس منصوبے پر لگ بھگ پندرہ ارب فرانگ خرچ ہوتے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ فراخ کشادہ سڑک جس پر بیک وقت چھ چھ موٹریں چل سکتیں۔ فرانس کی ایک کمپنی کے اشتراک سے معاہدہ ہو گیا تھا کہ ۱۹۸۳ میں ایران میں ایک لاکھ موٹریں بننے لگیں گی۔ چھ ائیر بس طیاروں کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔ تھامسن سے مشارٹ دیو کے ٹرانسمیٹر سپلائی کرنے کا معاہدہ بھی ہو گیا تھا۔ تہران اور شیراز میں بڑی بڑی عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔

اب کیفیت یہ ہے کہ ۱۹۷۸ میں ۱۸۰ فرانسیسی فرمیں ایران میں کام کر رہی تھیں ان میں سے آدھی اپنا بستر بوریا لپیٹ کر واپس جا چکی ہیں۔ باقی جو غیر ملکی کمپنیاں ایران میں باقی رہ گئی ہیں ان پر انقلابی مجلس نے کڑی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کے لئے کام کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ مجلس نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ معاہدہ قبل از وقت توڑنے کی صورت میں کسی قسم کا معاوضہ جرمانہ وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ انقلاب کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ بھاگ جاؤ۔

سیاسی انتشار معاشرتی طوائف الملوکی، مذہبی جنونیت نے امریکہ، جرمنی، اٹلی اور جاپان کی فرموں کو بھی دل شکستہ کر دیا ہے اور وہاں سے اپنا کاروبار سمیٹ رہی ہیں۔ ان کمپنیوں نے ایران میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کی تھی اور اب انہیں زبردست نقصان ہو رہا ہے۔ ہم نے ان سے ایک تجارتی معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے ہم دس ارب ڈالر سالانہ کی مصنوعات خریدنے کے پابند تھے۔ یہی ان کی واحد ضمانت تھی۔ لیکن معاہدے کی یہ بنیادی شق بھی ختم کر دی گئی ہے۔ موجودہ اقتصادی بحران کے نتائج بہت خوفناک نکلیں گے۔ پچھلے برسوں منافع اب سامنے آنا چاہئے تھا۔ اس نے خسارے کی صورت اختیار کر لی۔ تیل کی پیداوار بہت کم رہ گئی ہے اور جو سطح یہ چھو چکی ہے۔ وہاں تک کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ تیل چونکہ اب نااہلوں کے ہاتھ آ گیا تھا اہل کاریگروں کو چھٹی دے دی گئی ہے اس لئے اب مضحکہ خیز صورتیں سامنے آ رہی ہیں مثلاً زمین دوز کنوؤں کا پانی تیل کے کنوؤں سے مل گیا ہے گویا اس طرح تو ہمارے بعض ذخائر پانی کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ کمیونسٹ اور ان کے ساتھی رفتہ رفتہ مزدوروں اور کسانوں کی انجمنوں پر قابض ہو رہے ہیں۔ ڈائریکٹروں انجینئروں اور سپروائزروں کا تقرر یا برطرفی اب انقلابی رضاکاروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کی تقدیر چاہیں بنا دیں گے جس کی چاہیں بگاڑ دیں۔ یہ روس پرست لوگ پیداوار کے بارے میں بھی فیصلے خود کرتے ہیں۔ تنخواہیں بڑھانے کا بھی حق ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مزید بھرتی ہو نہیں سکتی۔ ہر قسم کی مراعات جو پہلے حاصل تھیں۔ وہ سلب کر لی گئی ہیں۔ اس لئے ''سبوتاژ'' کے صرف دو حل نکالے جاتے ہیں، یا تو فیکٹری یا وہ منصوبہ بند کر دیا جاتا ہے یا اسے قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک نئی بیوروکریسی پیدا ہو گئی ہے جو انتہائی بدعنوان ہے۔ رشوت ستانی اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے۔ جہاں نااہلی ہو گی، وہاں رشوت ستانی اور بددیانتی بھی ضرور ہو گی۔

ملک کا سارا صنعتی ڈھانچہ بیٹھ چکا ہے۔ اسٹیل تانبے اور ایلومینیم کارخانے، کانیں، بندرگاہیں، کاروں اور ٹریکٹروں کے کارخانے سب تقریباً بند پڑے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ بالکل ہی بند ہو جائیں مالکان کو مزید نقصان کا بھار اُٹھانا پڑے گا۔ بعض کارخانے اپنی اصل گنجائش کی صرف ۲۵ تا ۳۰ فیصد حد تک کام کر رہے ہیں اور وہ دو چار مزید گھٹیں گے اور پھر بند ہو جائیں گے۔ ہمارے انقلاب سفید نے مزدوروں اور کارکنوں کو جو مراعات دی تھیں۔ ان کا سب خاتمہ ہو چکا ہے۔ کارخانوں کے منافع میں ان کا جو حصہ تھا وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوا۔ منافع ہی ختم ہوا تو

27 جون کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک اور قرارداد منظور کی جس میں رکن اقوام سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جنوبی کوریا کو فوجی امداد فراہم کریں تا کہ علاقے میں امن وسلامتی کو بحال کیا جا سکے۔ اسی شام ایف ای سی او ایم کے 15 سٹاف افسروں کا ایک وفد جاپان سے روانہ ہوا اور بذریعہ طیارہ سیئول سے 25 میل دورہ سووان کے مقام پر پہنچا۔ سیئول پر اس وقت شمالی کوریا کی فوج کا قبضہ تھا۔ اگلے روز انہیں امریکی سفیر جان موکیو نے صورتحال سے باخبر کیا۔ اگلے روز خود جنرل میکارتھر اپنے ذاتی جہاز سی 121 کانسٹیلیشن عرف باتان کے ذریعے وہاں پہنچ گیا چار پی 51 مستینگ طیارے اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ پرواز کے دوران ایک یاک 9 لڑاکا طیارہ نمودار ہوا جسے انہوں نے مار گرایا۔ میکارتھر نے سٹاف افسروں اور اخبار نویسوں کی معیت میں جنوبی کوریا کے سرحدی علاقوں کا دورہ کیا' جہاں اس نے مہاجروں کے قافلے اور جنوبی کوریا کی فوج کے تباہ حال دستے دیکھے جو جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہاں سے وہ دشمن کے زیر قبضہ سیئول پر نظر ڈال سکتا تھا۔

میکارتھر اسی دن ٹوکیو لوٹ آیا اور پینٹاگان کو رپورٹ دی جس میں اس نے بتایا کہ امریکی افواج کے تیز اور فیصلہ کن حملے سے صورتحال کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اس نے درخواست کی کہ اسے جاپان میں قابض امریکی فوج کو استعمال کرنے کا اختیار دیا جائے۔ صدر ٹرومین نے اس کی درخواست کی کہ اسے جاپان میں قابض امریکی فوج کو استعمال کرنے کا اختیار دیا جائے۔ صدر ٹرومین نے اس کی درخواست منظور کر لی اور ساتھ ہی سارے جزیرہ نمائے کوریا کی بحری ناکہ بندی اور 38 ویں خط متوازی کے شمال میں واقع اہداف پر امریکی ائیر فورس کی بمباری کی بھی منظوری دیدی۔ گھنٹوں کے اندر اندر 24 ویں امریکی انفنٹری ڈویژن کے دستے جنوبی کوریا روانہ ہونے کے لئے ہوائی جہازوں پر سوار ہو رہے تھے۔

شمالی کوریا کی فوج سیئول پر قبضہ کے بعد رک کر خود کو از سر نو منظم کر رہی تھی۔ 5 جولائی کو اس نے حملہ دوبارہ شروع کر دیا اس وقت تک امریکی ڈویژن پوسان میں اتر چکا تھا پہلی جھڑپ اسی روز اوسان کے شمال میں ہوئی۔ یہ شہر سیئول اور تائی جون کے درمیان سڑک پر واقع ہے۔

شمالی کوریا کی فوج 21 ویں انفنٹری رجمنٹ کی پہلی بٹالین کو پس پا کر کے دریا کے ساتھ موجود 34 ویں انفنٹری رجمنٹ کی پہلی بٹالین کی طرف بڑھی۔ یہاں بھی اسے کم مسلح امریکی فوجیوں کو شکست دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ امریکی فوجی گاڑیاں اور ساز و سامان چھوڑ کر جنوب کی طرف بھاگے۔

یہی کچھ دوسرے مقامات پر بھی ہوا۔ 24 ویں امریکی انفنٹری ڈویژن کے سپاہیوں نے ہر جگہ خود کو گھیرے میں پایا۔ گھیرا توڑ کر بھاگنے کی کوشش میں انہیں بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ آخر وہ پس پا ہو کر نائے جون پہنچے اور وہاں صف بندی کی لیکن 19 جولائی کو شمالی کوریا کی فوج نے یہ صف بندی توڑ دی اور ڈویژن کے باقی ماندہ فوجی مزید جنوب کو پسپا ہو گئے اب تک کے 24 سو فوجی ہلاک ہو چکے تھے۔

اس دوران 10 جولائی کو جنرل میکارتھر جنوبی کوریا میں امریکی افواج کا کمانڈر انچیف بنایا جا چکا تھا۔ اس نے 8 ویں امریکی فوج کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل والٹن ایچ واکر کو آپریشنل ذمہ داریاں تفویض کر دیں جو اپنے ہیڈ کوارٹر سمیت 13 جولائی کو وہاں پہنچ گیا۔ اس کے بعد 25 واں امریکی انفنٹری اور پہلا امریکی کیولری ڈویژن بھی پہنچ گیا۔

25 ویں ڈویژن کو پہلا نقصان 20 جولائی کو پے چون کے مقام پر پہنچا جہاں شمالی کوریا کے شدید حملے کے بعد اس کی تین رجمنٹیں تتر بتر ہو کر پسپا ہو گئیں تاہم ڈویژن نے اپنی پوزیشنیں اس وقت تک برقرار رکھیں جب 30 جولائی کو اسے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس سے ایک دن پہلے امریکی کیولری ڈویژن کو یونگ ڈانگ کے علاقے سے نکلنا پڑا تھا جہاں وہ محصور ہو چلا تھا۔ جولائی کے آخر تک آٹھویں امریکی فوج ایک حلقے میں محصور ہو کر رہ گئی جس کی فرنٹ لائن نوبی شہر چن جو سے شمال میں کواں لی تک اور شمال مشرق میں پے چون تک اور مشرقی ساحل پر یونگ ڈاک تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس حلقے کو پوسان کو دائرہ کہا گیا۔ جونہی یہ مستحکم ہوا میکارتھر نے بڑے جوابی حملے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا جس کے تحت دسویں امریکی کور کو مغربی ساحل پر اتارا جانا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آٹھویں فوج نے پوسان سے باہر نکل کر حملہ کرنا تھا۔ اپریشن کو کرومائیٹ کا خفیہ نام دیا گیا۔ اپریشن کے تحت انچون کی بندرگاہ سے شمالی کوریا کی فوج پر عقب سے حملہ کیا جانا تھا۔

انچون پر گہرے پانی کی واحد رسائی 45 میل لمبی فلائنگ فش نامی رودبار ہے جو بندرگاہ سے 30 میل جنوب مغرب میں نوک جوک کنڈرجز ائر کے علاقے میں جا کر کھیلتی ہے۔ پانی اونچا ہو تو اس سے بڑے جہاز بھی گزر سکتے ہیں لیکن جب پانی اترا ہوا ہو تو وہ محض چند فٹ گہری ہوتی ہے اس لئے اس وقت اس میں جہاز نہیں آسکتے اس وجہ

ADMIN

MUHAMMAD NADEEM

0331-6362354

ALL NEWS NETWORK

News Headlines . Daily News Papers .

Job Adds Daily.Sports Headlines .

Weather Update . Breaking News

Teachers r Great

Only Teachers & Educational

Material Allowed

PDF KI DUNIYA

Only PDF Allowed

ہماری نئی نئی یونیورسٹیاں، اسکول، اسٹیڈیم، اسپتال فاؤنڈیشن تعمیراتی منصوبے مکانات پلازا، دیہات سدھار کے ہمارے کام، ہمارے ثقافتی مراکز، ہماری تربیت گاہیں، آجروں اور اجیروں کے مابین خوشگوار تعلقات، کاریگروں، ہنرمندوں اور کارکنوں کی فلاح و بہبود، عورتوں کی آزادی اور ان کے بشری حقوق کی بحالی یہ سب چیزیں ان کو ایک آنکھ نہ بھائیں انہوں نے ان سب خوبیوں کو برائی اور نیکی کو بدی بنا کر دکھایا۔ ہم اپنے مذہب سے جو زبردست عقیدت و محبت رکھتے ہیں اس کے باعث ہم نے بعض راسوائے زمانہ بدچلن بدکردار منافق مولویوں کے خلاف سخت کارروائی کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ہمیں کبھی خیال ہی نہ آیا تھا کہ اتنے زبردست جھوٹ بولے جائیں گے اور یہ کہ ایسے زبردست جھوٹ پر لوگ آسانی سے یقین بھی کرلیں گے۔ آج کل ابلاغ و تشہیر کا سب سے مضبوط ذریعہ ٹیلیویژن ہے لیکن جب اس بات کا ثبوت ہمارے سامنے آیا کہ اس ادارے میں کمیونسٹ گھس کر بڑے بڑے موثر عہدوں پر قابض ہو چکے ہیں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تطہیر کا وقت گزر چکا تھا۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں ایک ہزار افسروں اور فنی ماہرین میں سے نوسو کو برخواست کیا جا چکا تھا اور صرف ایک سو اپنے عہدوں پر برقرار رہ گئے تھے۔ اور یہ برقرار رہنے والے ہی کمیونسٹ تھے جو ہمارے انقلاب سفید کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

اس بحران کا اخلاقی پہلو بھی تباہ کن ہے۔ آیت اللہ خمینی کی خونریز اور مضحکہ خیز متشددانہ پالیسی پورے عالم اسلام اور بالخصوص شیعیت کیلئے تباہ کن ثابت ہوگئی۔ مذہب کے نام پر ایک ایسے ملک اور ایک ایسے معاشرے کو جس نے اس خطے میں امن کو علمبرداری کی تباہ کرنے سے قرآن مجید پر ایمان رکھنے والوں پر بھی اور ان پر بھی جن کا ایمان نیم پختہ ہے، خطرناک اثرات مرتب ہوں گے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ قم کا یہ احساس برتری اور یہ قتل و قتال یہ خونریزی اور منھی برھ ملاؤں کے بے درد آمریت اسلام کے بنیادی اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ اب فریب کاری کا پردہ چاک ہوا چاہتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ وہ کس منہ سے جہاد اور سچی اسلامی آئیڈیالوجی کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ درحقیقت پوری آبادی پر ایک ملحدانہ نظام بذریعہ انقلاب مسلط کر دیا گیا ہے۔ جب ہم ایران کی موجودہ صورت حال اور اس کے مستقبل پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل رونے لگتا ہے۔ سلطنت ایران کو احمقوں پاگلوں نے تباہ کر دیا ہے۔ زخم بہت کاری اور گہرا ہے لیکن یقیناً قابل علاج ہے۔ ایران کے عوام یقیناً اپنی آزادی اور نجات کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔

جلاوطنی کے آخری ایام

ہم نے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۹ء کو میکسیکو میں اپنی تصنیف ''آنسر ٹو ہسٹری'' کا اختتام کیا تھا۔ اس وقت ہم نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ ایک اور کتاب لکھنی پڑ جائے گی۔ جبکہ پہلی کتاب کا مسودہ مکمل کرنا بھی ایسے ہو گیا تھا جیسے وقت کے ساتھ دوڑ لگانا گذشتہ چند مہینوں کے دوران میں ہماری صحت بد سے بدتر ہوگئی ہے بخار تیز ہو جاتا ہے، سردی سے جسم کپکپانے لگتا ہے درد شدید ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹروں نے پہلے تو ملیریا تشخیص کیا۔ بالآخر یہ معلوم ہوا کہ گلے کا سرطان عود کر آیا ہے جس کا ہم سمجھے تھے کہ ختم ہو گیا ہے۔ میکسیکو میں وہاں کے مقامی ڈاکٹروں کے علاوہ وہاں مقیم فرانسیسی اور امریکی ڈاکٹروں کو بھی دکھایا۔ اب سب نے یہی مشورہ دیا کہ امریکہ جا کر مکمل معائنہ کراؤ جس کی پوری سہولتیں ہوسٹن یا نیویارک ہی میں مل سکیں گی۔ ہم امریکہ جانے کی بالکل خواہش نہ رکھتے تھے اس لئے ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ سے جب کہ تہران سے چلے تھے واشنگٹن نے ایک دفعہ بھی ہمیں امریکہ چلے آنے کے لئے نہ کہا۔ امریکی سفیر ولیم سلیوان نے تو پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ شاہ مختصر تعطیل پر جا رہا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ امریکیوں نے یہ بالکل واضح کر رکھا تھا کہ طبی علاج کی غرض سے جب چاہیں، امریکہ جا سکتے ہیں۔

اکتوبر میں علاج کے لئے امریکہ جانے کا فیصلہ ہوا بیماری اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہمیں یہ فیصلہ چاروں ناچار قبول کرنا پڑا۔ ۲۲ اکتوبر کو ہم میکسیکو سٹی کے ائیر پورٹ پر تھے۔ ایک جیٹ طیارہ ہمارے انتظار میں تھا۔ امریکہ کے قونصل جنرل نے داخلے کے ضروری کاغذات کی تکمیل کرائی، اس وقت کی خاص بات جو ہمیں یاد رہ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ قونصل جنرل نے ہمیں غور سے دیکھا تو بہت حیران رہ گئے۔ اس کے ذہن میں شہنشاہ کا تصور کچھ اور تھا جو بنیادی انسانی حقوق کا غاصب تھا۔ بڑا ظالم و جابر تھا۔ مطلق العنان فرمانروا تھا، اپنی قوم کو کچل کر رکھ دیا تھا یعنی ذرائع ابلاغ کرم فرماء سے لیکن اس نے دیکھا تو یہ شہنشاہ یکہ و تنہا تھا بیمار، نحیف و نزار، جس کے لئے اب چلنا بھی دوبھر تھا اور وہ اس کے کاغذات مکمل کر رہا تھا۔ بہرصورت قواعد و ضوابط کی رسمی تکمیل کے بعد ہمارا چھوٹا سا قافلہ جہاز کی طرف رواں ہوا۔ ایران سے رخصت ہوئے ہمیں نو ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے یہ مہینے ہم نے انتہائی کرب اندوہ، صدمے، قلق مایوسی، اداسی اور تفکر میں گزارے ہیں۔ ایران میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خبریں سن سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہر روز قتل و غارت گری، خونریزی، خانہ جنگی، سرسری سماعت کے بعد پھانسیوں، کوڑوں معصوم بے گناہ لوگوں اور اپنے

ہم نے اپنی جلاوطنی کے آخری ایام گزارنے کے لئے جن ممالک کی فہرست ذہن میں بنا رکھی تھی ان میں میکسیکو سر فہرست تھا۔ چنانچہ میکسیکو کے آسمان تلے شب بسری کا امکان دریافت کرنے کے لئے فوری طور پر کوششیں شروع کر دی گئیں۔ اس ضمن میں ہمارے بعض امریکی دوستوں نے بھی ہماری مدد کی، جن میں ہنری کسنجر اور کارٹر انتظامیہ کے بعض عہدے دار شامل ہیں۔ بہاما سے نکل جانے میں جب دو روز باقی رہ گئے تو ہمیں میکسیکو آنے کی دعوت ملی۔ ہمارے آدمی پہلے چلے گئے تا کہ کسی مکان کا بندوبست کر لیا جائے، چنانچہ کورناواکا کی ایک چھوٹی گلی میں کرائے کا ایک مکان مل گیا جو میکسیکو سٹی سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔

۱۰ جون کو بذریعہ طیارہ ہم میکسیکو پہنچے اور ایک چھوٹی سی کار کے ذریعے کورناواکا والے ''اپنے گھر'' میں داخل ہوئے۔ صدر لوئیز پورٹیلو نے ہمارے تحفظ و سلامتی کا معقول اور ضروری انتظام کر رکھا تھا۔ خلوت اور تنہائی کی ہمیں شدید ضرورت تھی۔ بہاما میں ہمیں تنہائی بالکل نصیب نہ ہو سکی تھی کیونکہ ہم لوگوں کی دلچسپی اور تفریح کا سامان بنے رہتے تھے۔ اس وقت ہمارے صحت بھی اتنی خراب نہ ہوئی تھی جو لوگ ملتے جلتے تھے ان کا رویہ دوستانہ تھا، اس لئے کسی قدر ہماری بھی تفریح ہو جاتی تھی ہم نے صدر پورٹیلو سے دوستی کے خوشگوار ماحول میں ملاقات کی اور وہاں چپ چاپ زندگی بسر کرنے لگے۔ اب گویا وہ پرسکون وقت آ گیا تھا، مناسب تنہائی بھی مل گئی تھی کہ ہم ایران میں ہونے والے حالیہ بحران کے سیاسی و جغرافیائی مضمرات کے بارے میں غور و فکر کر سکتے تھے اور ان مضمرات و نتائج کی روشنی میں آزادی نا کے متعلق اپنے فلسفے اور طرز فکر کو نئی صورت دے سکتے تھے۔ وہاں ہم سے ملنے کئی پرانے دوست آئے۔ صدر نکسن آئے، ہنری کسنجر آئے۔ دونوں ہمارے گہرے دوست ہیں محض ذاتی دوستی ہی نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر پرانے رفیق کار اور ہم نوا جنہوں نے خطے کے مسائل کو حل کرنے میں ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ مسائل کی شدت و اہمیت کو سمجھنے اور ان کا کوئی مناسب حل نکالنے میں ہمارے ساتھ مل کر سوچا ہے، عمل بھی کیا ہے۔ ان کے عہد حکومت میں امریکہ اور ایران کے باہمی تعلقات انتہائی خوشگوار اور دوستانہ رہ چکے تھے۔

رچرڈ نکسن سے ہمارے دوستی ۱۹۵۳ء سے ہے جب وہ آئزن ہاور کے نائب صدر تھے۔ جب وہ خود امریکہ کے صدر بنے تو بحیثیت سیاسی رفیق ہمارے تعلقات مزید پختہ ہو گئے۔ صدر فورڈ کے زمانے میں بھی تعلقات کی یہی نوعیت رہی۔ خارجہ امور معاملات کے بارے میں نکسن کو خداداد بصیرت حاصل ہے۔ مردم شناس ہیں اور واقعات حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ویت نام کی جنگ بند کرانا اور جمہوریہ چین سے تعلقات استوار کرنا ان کے ایسے اقدامات ہیں جو عقل سلیم انسانی دوستی اور وقار پر مبنی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی طاقت کے توازن کے بارے میں ان کی نظریات سے امریکہ کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ان کے صدر بننے سے پہلے تہران میں ان سے ہمارے طویل مذاکرات ہوئے تھے جن کا موضوع سیاسی و جغرافیائی مسائل تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے ہمارے نظریات میں بڑی مشابہت اور اتفاق رائے ہے۔ مثال کے طور پر ہم دونوں کو اس امر پر کامل اتفاق رائے تھا کہ قوم کو اپنے قدرتی دوستوں، یعنی ایسے ممالک سے معاہدہ تعاون کرنا چاہیے جن کے مفادات مستقل طور پر مشترک ہوں۔ مشکوک ساتھیوں سے احتراز کرنا چاہیے ورنہ وہ بلائے جان بن کر رہ جاتے ہیں۔ دوست ہوں تو گہرے اور پختہ ہوں، ورنہ بالکل نہ ہوں۔ ایک پکا اور سچا دوست دس ایسے حصہ داروں سے زیادہ اچھا ہوتا ہے جو عین وقت پر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ رچرڈ نکسن ایک ایسا سچا امریکی ہے جس نے ہمارے پاس کورناواکا کی جلاوطنی میں ہمارے پاس آ کر اور ہمارے دلجوئی کر کے ثابت کر دکھایا دیرینہ دوستی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

ہنری کسنجر سے بھی ہمارے تعلقات مختلف وقتوں اور حالات میں دوستانہ اور خوشگوار رہ چکے تھے۔ پہلے نیشنل سیکورٹی کونسل کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں پھر صدر نکسن کے وزیر خارجہ اور پھر صدر فورڈ کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے وہ ایک سلجھے ہوئے اور سنجیدہ و متعین سیاست دان اور سفارت کار ہیں۔ امریکی اور بین الاقوامی امور کے شعور آگہی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ آبرومندانہ عالمی امن قائم کرنے کے سلسلے میں انہیں نے امریکی ذمہ داریوں کو بھی خوب نبھایا اور اصول پرستی سے بھی انحراف نہ کیا۔ غیر معمولی ذہین و فطین ہونے کے لئے قدرت نے انہیں دو اور اوصاف سے بھی نوازا ہے جو بڑے آدمیوں میں کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں، یعنی دوسرے کی بات ٹھنڈے دل سے اور تحمل سے سنتے ہیں اور طنز مزاح کی غیر معمولی حس رکھتے ہیں۔ ہم تینوں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ عالمی کمیونزم کے متبادل کے طور پر یورپی کمیونزم کا طلسم بھی اب ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے باوجود کمیونسٹ ہر جگہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور کہیں نہ کہیں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایسے اقتدار سے کوئی غرض نہیں رکھتے جس میں کوئی اور شریک ہو۔ انہیں مکمل کنٹرول چاہیے سیاست میں ان کی انتہا پسندی کا مظاہرہ ہر جگہ ہو رہا ہے۔ مثلاً کیوبا کے چالیس ہزار سے زیادہ کرائے کے سپاہی، براعظم افریقہ میں انگولا سے لے کر ایتھوپیا تک جنگ، بغاوت اور کمیونزم کے ذریعے دہشت اور فرہر اسانی پھیلا رہے ہیں۔ افریقہ مستقبل کا براعظم ہے وہاں کا خام مواد مغربی ممالک صنعتوں

وائٹ ہاوس سے معاہدے پا چکا تو صدر کارٹر نے ہمیں ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے ہماری خیریت دریافت کی اپنی خیر خواہی کا اظہار کیا اور کہا کہ کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے مدگار ہمارے پاس پہنچ جائیں گے اور ہمیں واپس امریکہ بلا لیا جائے گا۔ یہ پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ صدر کارٹر سے ہماری ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تھی جب سے کہ ہم نے ان کو دورہ ایران کے بعد تہران کے ائیر پورٹ سے الوداع کہا تھا۔ سازوسامان باندھنے کے لئے ہمارے پاس فقط ایک دن تھا۔ ۱۵ دسمبر جمعہ کو پو پھٹنے سے پہلے ایک چھوٹی سی موٹر کار ہمیں لے کر کیلی فیلڈ پہنچی جہاں امریکی فضائیہ کا ۹ سی ٹرانسپورٹ طیارہ ہمیں پاناما لے جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ صبح سات بجے ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ امریکہ کے وعدوں کی گھنٹی اب تک ہمارے کانوں میں بج رہی تھی۔ جزیرہ کونتادورا میں ہمارے ابتدائی ہفتے انتہائی خوشگوار گزرے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے بہشت کا ٹکڑا کاٹ کر وہاں رکھ دیا ہے چار بیڈروم کا یہ کشادہ مکان سفیر لیوس کی ملکیت تھا، ساحل پر واقع تھا اور سخت پہرے میں تھا۔ یہ جزیرہ بحرالکاہل میں پاناما کے ساحل سے تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مکان سے سمندر کے اطراف کا منظر دیدنی تھا۔ ریڈیائی شعاعوں سے ہمارے گلے میں ہر وقت خراش رہنے لگی تھی وہاں کی دھوپ اور مرطوب ہوا سے اس کو بھی فائدہ ہوا۔ وہاں پاناما کے کئی لیڈر ہم سے ملنے آئے۔ جنرل توریجوس نے تو کئی مرتبہ ہمارے ساتھ لنچ کیا۔

ڈیوڈ فراسٹ پورے سازوسامان کے ساتھ ٹیلیویژن پر ہمارے انٹرویو لینے کے لئے جزیرے پر پہنچ گیا۔ اس انٹرویو سے ہمارے ذہن کو بھی تحریک پیدا ہوئی، سوال جواب سے ہم بہت لطف اندوز ہوئے۔ برس ہا برس سے ذرائع ابلاغ کا دوستانہ مقابلہ کر کے ہمیں لطف آتا تھا۔ تہران میں مقیم بعض بڑے اخبارات وجرائد کے نمائندوں کو ہم سے وقت لینے میں بعض اوقات بڑی دقت پیش آتی تھی۔ غیر ملکی نامہ نگاروں سے گفتگو کر کے خواہ ان کے سوالات کتنے بھی اشتعال انگیز ہوں ہمیں بڑے بڑے سیاسی موضوعات پر اظہار خیال کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ استدلال، مذاکرات مکالمہ، گفتگو وغیرہ آدمی کے ذہن کو جلا بخشتے ہیں اور خیالات کو صاف اور واضح کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ پھر انٹرویو لینے والا ڈیوڈ فراسٹ جیسا زیرک اور ذہین صحافی ہو۔ وہ پوری تیاری کر کے آیا تھا ایران کے حالات سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا اس لئے اس سے ٹیلیویژن پر گفتگو کر کے ہمیں بھی مزا آیا۔ امریکہ کے ذرائع ابلاغ نے اپنا ذہن بنا رکھا تھا کہ ایران کو کیسا ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ وہ یہ دیکھتے کہ ایران کیا تھا؟ اب کیا بن گیا ہے اور کیا بن رہا ہے؟ کچھ عرصہ پہلے تک ایران ازمنہ وسطی کا ایک قبائلی معاشرہ تھا جو آج کی ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ ایسے ملک کا موازنہ ایسے ممالک سے کرنا جہاں صدیوں کی جمہوری روایات ہیں جہاں کی شرح خواندگی بہت زیادہ ہے ایسا ہے جیسے سنترے کا موازنہ سیب سے کرنا۔ پیچیدہ سوالات کے جواب سے بہتر ہے خاموشی اختیار کر لی جائے۔

جنگ عظیم کے بعد کی امریکی تاریخ یہ تقاضا کر رہی ہے کہ پوری دنیا امریکہ جیسی ہو جائے، خواہ دوسرے ملکوں کی سیاسی اقتصادی معاشرتی تاریخ کیسی بھی ہو اور کیسی بھی رہی ہو۔ ویت نام کی مثال ہمارے سامنے ہے فرانس میں اتنی حس بھی نہ تھی، اس نے اپنے نمونے اور طرز کی ایک نئی قوم تشکیل شروع کر دی۔ جب ڈائم نے ناقابل حصول جمہوری آئیڈیل کی تکمیل سے انکار کر دیا تو امریکی انتظامیہ نے اسے قتل کرا دیا۔ یاد رہے کہ جس دن اسے قتل کیا گیا وہ کمیونسٹوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کر رہا تھا اور اسی دن سے باگ ڈور ویٹ کانگ اور شمالی ویٹ نام کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ آئندہ بیس سال تک بھی امریکہ اور جنوبی ویت نام مل کر اس نقصان کی تلافی نہ کر سکے۔

۲۱ جنوری کو ایران کے نئے حکمرانوں نے اپنی مسلسل جارحانہ جنگ کا نیا محاذ ایرانی تاریخ اور ہماری ذات کے خلاف کھول دیا۔ انہوں نے مطالبہ داغ دیا کہ پاناما کی حکومت ہمیں ان کے حوالے کر دے۔ اس تحریک پر ہمیں ذرا بھی حیرانی نہ ہوئی لیکن ہمارے میزبان کے تذبذب نے ضرور حیرت میں ڈال دیا۔ بجائے اس کے کہ اس مطالبے کو حقارت سے مسترد کر دیا جاتا، پاناما کی حکومت ان افواہوں کا مرکز بن گئی کہ وہ تہران سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے اور وہ یرغمال کے بدلے ہمیں ایرانی حکومت کے حوالے کر دے گی۔ یہ منافقت کے ایک عجیب کھیل کا آغاز تھا۔ ایک طرف تو پاناما والے خفیہ ملاقاتوں میں ہمیں یقین دلا رہے تھے کہ ہم کسی قیمت پر بھی آپ کو پاناما سے نہ جانے دیں گے کیونکہ یہ پاناما کے قانون وروایات کی خلاف ورزی ہوگی۔ ڈیوڈ فراسٹ کے ٹیلیویژن انٹرویو کے ایک ہفتے بعد قطب زادہ نے ایک اور شگوفہ چھوڑ دیا۔ اس نے دعوی کیا کہ پاناما میں ہم نظر بند ہیں۔ ۲۴ جنوری کو حکومت پاناما نے سرکاری طور پر اس کی تردید کی۔ لیکن چند ہی روز کے بعد حکومت اپنی تردید سے مکر گئی۔ اخبارات میں یہ اطلاعات آنے لگی ہیں کہ ''فنی وجوہ'' سے ہماری ملک باہر کرنے کا امکان پایا جاتا ہے لیکن خفیہ طور پر ہمیں یقین دلایا گیا کہ یہ اطلاعات بے بنیاد ہیں۔

یہ ظالمانہ کھیل فروری تک کھیلا جاتا رہا۔ فروری میں پاناما کے وزیر خارجہ نے کہا کہ ہم واقعی قیدی ہیں کیونکہ ہم

اس ڈرامے کا اگلا ایکٹ بہت عجیب اور دلچسپ ثابت ہوا۔ مارچ کے اوائل میں ڈاکٹر کین اور ہمارے امریکی مشیر مسٹر آرماؤ نے مل کر ڈاکٹر گارشیا سے میٹنگ کی۔ گارشیا جنرل توریجوس نے ذاتی معالج بھی ہیں اور پٹیلا اسپتال کے حصہ دار مالک بھی۔ اس میٹنگ میں پٹیلا میڈیکل سنٹر کے دوسرے میڈیکل افسر اور جونیئر ڈاکٹر موجود تھے۔ ڈاکٹر گارشیا کا بھی یہی اصرار تھا کہ آپریشن پٹیلا اسپتال ہی میں کیا جائے۔ ڈاکٹر کا کہنا یہ تھا کہ یہاں سہولتیں ناکافی ہیں۔ ہم نے جارجس میں ایک انتہائی اچھا اور بیش قیمت خون صاف کرنے والا کمپیوٹر نصب کر رکھا ہے موجودہ صورت میں خون نکالا جائے گا۔ پٹیلا میں اور اس کا تجزیہ کرنے کے لئے بھیجا جائیگا۔ جارجس میں میٹنگ میں کچھ گرمی سردی ہوگئی۔ پاناما کے ڈاکٹر جذباتی اور گنگ مزاج تھے۔ ہمارے آدمیوں کے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہو رہا تھا کہ اس مقدس پیشے کے لوگ بھی مریض کے علاج پر قومی انانیت کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ جب مقامی ڈاکٹروں کو پیشے کے نام پر غیرت دلائی گئی تو ڈاکٹر گارشیا نے صاف ہی اعتراف کرلیا کہ ہم تو محض کارٹر کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ حکم کی تعمیل ہی ہمارا اصول ہے۔ بالآخر اس نے میٹنگ کا خاتمہ اس الٹی میٹم کی صورت میں کر ڈالا۔ ''آپ یا تو پٹیلا اسپتال چلیں ورنہ ائیر پورٹ کا راستہ پکڑیں۔''

اس بات پر ہمارے عملے آدمیوں کو بہت طیش آیا لیکن ہم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ بے بس ولاچار تھے صاف ظاہر تھا کہ ایران ہمیں پاناما میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنے یرغمالیوں کو چھڑانے کے لئے ہمیں بطور ''چارہ'' استعمال کر سکے۔ ہم کوستا دورا کے خوبصورت اور جنت نظیر جزیرے میں پیارے امریکہ کے پیارے قیدی کی حیثیت سے رہ سکتے تھے۔

۱۱ مارچ کو آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ آپریشن ناگزیر تھا۔ ڈاکٹر میکائیل پٹیلا اسپتال میں آکر آپریشن کرنے پر رضامند ہوگئے تھے۔ ہمیں جزیرے سے پاناما سٹی لے جانے کے مناسب انتظامات کر لئے گئے تھے۔ ہماری تین ہمشیرگان بذریعہ طیارہ پاناما پہنچ گئی تھیں تاکہ آپریشن کے وقت وہ ہمارے پاس موجود ہوں۔ ۱۴ مارچ کو ہمیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر میکائیل، ڈاکٹر کین اور ان کے ماتحت ایک ٹیم کی سی صورت میں پہنچ گئے۔ سکیورٹی گارڈ نے انہیں اسپتال میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ایک گارڈ نے کہا۔ جنرل صاحب نے حکم دے رکھا ہے کہ کسی امریکی ڈاکٹر کو شاہ کے پاس جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ امریکی ڈاکٹروں نے حفاظتی سپاہیوں سے جرح شروع کر دی۔ بڑی بحث کے بعد کرنل انچارج اس بات پر رضامند ہوگیا کہ جنرل توریجوس سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا جائے۔ ٹیلی فون پر جنرل نے ڈاکٹر گارشیا سے کہا۔ گارشیا نے کرنل سے کہا کہ امریکیوں کو جانے کی اجازت دی جائے۔ ڈاکٹر گارشیا کو اس پر بڑا طیش آیا۔ اس نے اپنی توہین محسوس کی۔ اس نے کہا کہ امریکی ڈاکٹروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ معمولی آپریشن ہے اور پاناما کے ڈاکٹر ایسا آپریشن کرنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گارشیا نے دعویٰ کیا کہ یہ آپریشن چالیس منٹ کے اندر اندر ہو جائے گا۔ ہمیں ان کا یہ رویہ طفلانہ اور احمقانہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس سے بالآخر ہمیں اپنا فیصلہ کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہاں ہمارے زندگی خطرے میں ہے اور کم از کم ہم ان معمولی ڈاکٹروں کے ہاتھ سے نہیں مرنا چاہئیں گے۔ ہم نے اپنے ڈاکٹروں یعنی کین اور میکائیل سے مشورہ کیا اور یہی فیصلہ ہوا کہ آپریشن ہے تو ناگزیر، لیکن کچھ روز کے لئے ملتوی کر دینا چاہیے۔ دوسرے دن ہم اسپتال سے واپس جزیرے میں چلے گئے۔ ہمارے اس اقدام سے جنرل توریجوس نے توہین محسوس کی۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر پاناما کے ڈاکٹروں کا ایک وفد ڈاکٹر مائیکل سے ان کے ہوٹل پر ملا اور ان سے اپنے فیصلے نظر ثانی کے لئے کہا گیا لیکن وقت گزر چکا تھا اب ہم اپنی زندگی اور صحت کو ان لوگوں کے ہاتھوں دینے کے لئے تیار نہ تھے جو ایک مریض کو اپنی ذاتی انا کے تابع رکھ سکتے ہیں۔ دو روز بعد ۱۶ مارچ کو قدرت نے غیب سے ہماری مدد کی۔ واشنگٹن پوسٹ۔ کے پہلے صفحہ پر کالم نویس جارج ول نے اک مضمون لکھا تھا جس میں امریکہ کے ایک دوست کے ساتھ پاناما کے ''حسن سلوک'' کی داستان پوری تفصیل سے بیان کی گئی تھی۔ اہل امریکہ کو اب سب کچھ معلوم ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر ہم نے صدر انور السادات کی سیاسی پناہ دینے کی پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ پیشکش مستقل تھی اور اسی دن سے قائم تھی جب سے ہم ایران سے جدا ہوئے تھے۔ صدر سادات سے بھی ہمارا رشتہ دوستی کا تھا اور دیرینہ تھا۔ وہ بڑے معزز، شریف النفس اور رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ جلاوطنی کے ان کٹھن ایام میں ان کے گہرے جذبات سے ہمیں اور ملکہ فرح کو بڑی تقویت پہنچتی تھی۔ جب ہم پاناما میں رہے تقریباً روزانہ صدر سادات اور ان کی بیگم جیہان ٹیلیفون پر ہم سے گفتگو کر کے ہماری خیریت دریافت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہم سے ایک یہ بات پوچھا کرتے تھے۔ ''مصر کب آرہے ہو؟''

۲۱ مارچ کو ہملٹن جورڈن پاناما پہنچے۔ انہوں نے ہمیں فون کیا کہ وہ جزیرے میں ہماری رہائش گاہ پر ہم سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔ ہمارے مشیر باب ارماؤ نے ان سے کہا کہ اب آنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم پاناما چھوڑ

آخری حصہ

خاتمہ کلام

۱۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو ہم نے کورنا واکا میکسیکو میں ایک پریس کانفرنس کے موقعہ پر کہا تھا۔ ایران میں نہ کوئی مملکت ہے نہ کوئی حکومت، ہمارے ملک میں انتشار در انتشار کی کیفیت ہے۔ ایران ایک انتظامی انقلاب کی گرفت میں ہے جو ہر اس چیز کو نیست و نابود کر رہا ہے جو انقلاب سفید نے بنائی تھی۔ اتنا محسوس کر کے بھی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ قوم تباہی سے گزر کر نیستی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جہاں یہ راہ ختم ہوگئی، وہاں کمیونزم اس کے انتظار میں بیٹھا ہوگا جو حالیہ بحران سے بھی زیادہ خوفناک، خونخوار، اور بھیانک ثابت ہوگا۔

حکومت بذریعہ احتساب کوئی اچھی چیز نہیں ہے، کبھی بھی نہیں رہی۔ تاہم ہمارا ملک جنوری ۱۹۷۹ سے اب تک احتساب کے جوئے تلے دبا ہوا ہے۔ سپین میں جو تاریخی احتساب ہوا تھا اس کے سات سو سال بعد ایران اسی نوعیت کے احتساب سے گزر رہا ہے جو اس سے بھی زیادہ بے رحم، بے درد، سخت اور ظالمانہ ہے۔ سپین میں احتسابی عدالتیں صرف اسی وقت پھانسی کی سزا سناتی تھیں جب ثابت ہو جاتا تھا کہ ملزم کافر دلحد ہے، اسے گواہیاں بھگتانے کی اجازت تھی، اسے نائب ہونے کی اجازت تھی، وہ توبہ کر لیتا تھا تو اسے معاف کر دیا جاتا تھا۔ ایران کی احتسابی عدالتیں نہ سنتی ہیں نہ کچھ کہتی ہیں، سیدھی گولی سینے میں اتار دیتی ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ان ''عدالتوں'' کو اسلام کے مقدس نام سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی۔ اسلام ایک ایسا سچا دین ہے اور اس کا قانون ایسا معتدل ہے کہ وہ ملزم کو صفائی کا پورا موقعہ دیتا ہے۔ نفرت، حقارت، انتقام اور قتل و قتال کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ ان چیزوں سے اسلام کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ نہ اسلام کا بول بالا ہو سکتا ہے۔ انصاف، شرافت، صداقت، رحم دلی، معافی اور اعلیٰ اخلاقی کردار سیرت ہی سے اسلام کی خدمت ہو سکتی ہے۔ یہی اسلام کا سبق ہے۔ یہی اسلام کے اصول ''اللہ کے نام پر'' نفرت و حقارت کی اشاعت (اللہ معاف کرے)، اللہ اور اس کے دین کی توہین ہے۔ ہم ایک بار پھر کہتے ہیں کہ اس رویے سے اسلام کی کوئی خدمت نہ ہوگی بلکہ اسلام کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جس طرح کہ اسپین میں احتساب سے عیسائیت کو پہنچا تھا۔ ہمیشہ سے ہمارا عقیدہ رہا ہے کہ مذہب کا احترام اس کی روح کو سمجھنے اور اس پر صدق دل اور خوش نیتی سے عمل کرنے میں پوشیدہ ہے۔ فرقہ پرستی مذہب کی روح کے منافی ہے۔ مخلوط تعلیم کے اسکول بند کر دینا، عورتوں کو برقعہ پہننے پر مجبور کر دینا، ان کی عائلی زندگی میں دوسری عورتوں کو ان کی مرضی کے بغیر شریک کرنا، شوہروں کی ہر قسم کی زیادتی کے باوجود ان سے طلاق لینے کی ممانعت کرنا یا ان کی کمتر پوزیشن میں رکھنا، یہ سب کچھ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ ہے کہ خواتین کو مکمل آزادی حاصل ہو۔ انہیں تعلیم کا حق دیا جائے، ان کے وقار کی تکریم کی جائے اور ہر شعبہ حیات میں ان کو مردوں کے ہم پلہ سمجھا جائے۔ کیا یہ انسانیت ہے کہ انسان کو سنگسار کیا جائے اور اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے اور دلیل یہ دی جائے کہ ازمنہ وسطیٰ میں خلفاء کے عہد میں بھی یہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ اسلام کی روح یہ نہیں ہے کہ بدی کا جواب بدی سے دیا جائے۔ اسلام کی روح یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے، اس کو معاف کیا جائے، اس کی بلندی و برتری کی سطح پر لے جانے کی کوشش کی جائے۔ ایران کا مستقبل ماضی کی غلطیوں اور عیوب میں پنہاں ہے۔ بلکہ قوم کی پوری تہذیبی میراث کے تحفظ میں پنہاں ہے، جو موجدوں اور خلاقوں کی تین ہزار سالہ جدوجہد اور ایثار خلوص سے مجتمع ہوئی ہے۔

ایران کا پرچم ہمارے پہلوی خاندان کی نشانی نہیں ہے۔ پوری تاریخ میں لاکھوں کروڑوں ایرانیوں نے اس کے زیر سایہ قربانیاں دی ہیں۔ اب نام نہاد انقلاب کے رہنما اس کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ اپنی تاریخ سے پوری ایرانی تاریخ سے ایسی شدت نفرت خود بانی اسلام کے احکام و ہدایات کی خلاف ورزی ہے۔ آج نوشیروں کو ''ظالم'' کہا جا رہا ہے۔ جبکہ اس بادشاہ کے بارے میں حدیث نبوی موجود ہے کہ ''ہم ایک عادل بادشاہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔'' ایک اور بادشاہ یعنی شاہ اسماعیل صفوی کو بھی آج برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ وہ بادشاہ تھا جس نے ایران کو سرکاری طور پر شعبہ مملکت بنایا تھا۔ ہمیں سب سے زیادہ تکلیف اسی بات کی ہوتی ہے کہ ہمارے قومی اتحاد اور ہماری ثقافتی و روحانی میراث کو اس نام نہاد انقلاب سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ یہ چیزیں ایران کا تشخص ہیں۔ اگر ان کو برباد کر دیا گیا تو پھر ایران کہاں باقی رہے گا۔

حال ہی میں ایران میں ایک نعرہ گونجنے لگا ہے۔ مرگ بر ما جنہوں نے کہا تھا، مرگ بر شاہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے بہت دور تک دیکھا تھا، ہم بہت تیز چلے تھے، لیکن یہ بھی تو بالکل واضح ہے کہ بعض بیرونی ایجنٹوں نے ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کی۔ ہم ان کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم ایران کو نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ ایک بات اور، یہ درست ہے کہ ایران اسلام سے پہلے بھی موجود تھا لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ایران کو موجودہ بلند و برتر سطح پر آنحضورؐ ہی لائے تھے۔ جنہوں نے ایرانیوں کے بارے